عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

ایک ملی اسلامی مجلہ

دسمبر ۱۹۳۸

ایک روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

مرتب

محمد یونس

بدل اشتراک

سالانہ دس روپے

ششماہی چھ روپے

جلد ۱ — قیمت فی پرچہ ایک روپیہ — نمبر ۱۲

فہرست

آدمی نہیں ملتے	۲	عالم اسلام (عقائد)	۱۷
سن رکھئے!	۴	جناب پرویز	..
عدالت کا فیصلہ	۵	اسلام کا نظریۂ جہاد (۳)	۳۲
رکشا والا	۶	حکیم حیدر زمان صاحب صدیقی	..
غالب ہمیں نہ چھیڑ	۹	ادب کی اسلامی قدریں	۳۴
چائے کا دور	۱۰	پروفیسر محمد موسیٰ خاں کلیم	..
شاعری نے مار ڈالا	۱۱	نقد و نظر	۳۹
مجلس دستور ساز کے اراکین سے	۱۲	غبار خاطر	..
اتاترک کا آخری پیغام	۱۳	محترم ممتاز حسن صاحب	..
لمعات	۱۴	ایک بیلی	۴۳
بقیہ لمعات صفحہ ۶ سے آگے	۴۶		

آدمی نہیں ملتے

"حکیم جی! رات بھر کھانسی اٹھتی رہتی ہے۔ پسلیاں دکھ جاتی ہیں۔ ایک منٹ کیلئے سونا نہیں ملتا۔"

"بڑے میاں یہ بڑھاپا ہے۔" حکیم جی نے کہا۔

"حکیم جی! بھوک قطعاً بند ہے۔ دو لقمے کھا لیتا ہوں تو چھاتی پر بوجھ سے رہتے ہیں۔"

"بڑے میاں۔ یہ بڑھاپا ہے۔"

"حکیم جی! بینائی کم ہو رہی ہے۔ اب سنائی بھی اونچا دیتا ہے۔ اٹھتا ہوں تو پاؤں لڑکھڑاتے ہیں۔"

"بڑے میاں۔ بڑھاپا ہے۔"

"تجھے کس پاجی نے حکیم بنا دیا۔ گدھا کہیں کا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں۔ کہہ دیتا ہے بڑھاپا ہے؟"

"بڑے میاں: یہ بھی بڑھاپا ہے۔" حکیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بڑے میاں اور حکیم جی کا قصہ افسانہ ہو یا حقیقت، لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ مملکت پاکستان کے ارباب حل و عقد میں سے کسی سے شکایت کیجئے، ان کا جواب ایک ہی ہو گا۔ مثلاً۔ آپ کہئے

"مہاجرین کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ وہاں کوئی انتظام درست نہیں۔ ان کی کوئی نہیں سنتا۔"

جواب ملے گا۔ "کیا کریں آدمی نہیں ملتے۔"

"پبلک چٹھیاں لکھ لکھ کر تنگ آ جاتی ہے۔ انہیں ہر روز دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ کہیں سے کوئی جواب نہیں ملتا۔"

"کیا کریں آدمی نہیں ملتے؟"

"بڑی ضرورت ہے کہ حکومت اور عوام میں رابطہ پیدا کیا جائے۔ ان کا باہمی اعتماد بڑھایا جائے۔"

"کیا کریں۔ آدمی نہیں ملتے۔"

"تو آدمی پیدا کرنے کی کوئی سبیل کیجئے۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔"

"اس کے لئے بھی آدمیوں کی ضرورت ہے اور آدمی ملتے نہیں۔"

ہمارے ارباب بست و کشاد یہ جواب دیکر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں وہ ان سب سے سبکدوش ہو گئے لیکن یہ معاملہ ایسا نہیں جسے یہیں تک ختم کر دیا جائے۔ یہ ساری قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ ساری مملکت پاکستان میں

اں آدمی بھی نہیں جو ... اور

(۵) اس پانچ چھ کروڑ کی آبادی میں سو پچاس آدمی بھی ایسے نہیں ہیں جن کے ہاتھ میں زمام ملت، اعتماد اور بھروسہ سے سونپی جاسکے۔

تو یہ مقام بڑے غور و فکر کا ہے۔ کوئی حکومت آدمیوں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ نہ کبھی کوئی چلی ہے اور نہ یہ چلے گی۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ صورت حالات ایسی مایوس کن نہیں جیسی بتائی جاتی ہے۔ ہماری قوم ایسی عقیم نہیں ہو چکی کہ اس میں آدمی پیدا ہونے بند ہو چکے ہوں۔ نوجوان طبقہ میں یقیناً ایسے ہونہار دل و دماغ موجود ہیں جو تھوڑی سی حوصلہ افزائی اور تربیت سے نہایت موزوں "آدمی" بن سکتے ہیں۔ موجودہ ارباب حکومت کو دیکھئے۔ ان میں سے کونسا ہے جس نے حکومتی کاروبار کی ٹریننگ حاصل کی تھی؟ اگر یہ حکومت چلا سکتے ہیں تو ان جیسے اور ان کے رفقائے کار کیوں نہیں بن سکتے۔ جنہیں آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ آدمی پیدا کرنے کا انتظام کیا کرتے ہیں۔ تحریک پاکستان کے زمانہ میں "آدمی" ہونے کی شرط یہ تھی کہ وہ کسی جاگیردار کا بیٹا ہو۔ (غالباً) اس لئے کہ لیگ کے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا کہ وہ کام کرنے والوں کو معاوضہ دے سکے۔ لیکن اب تو حالت وہ نہیں۔ اب تو یہ حالت ہے کہ جو لوگ اس زمانہ میں اعزازی کام کر سکتے تھے (اور اب بھی کر سکتے ہیں) وہ بھی ہزاروں کے معاوضے پاتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ "آدمی" ہونے کے لئے اب بھی وہی شرط رکھی جائے؟ ہمارے ہزاروں تعلیم یافتہ، صحیح الدماغ اور صالح قلب افراد موجود ہیں جو محض اس لئے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ وہ جاگیرداروں کے بیٹے نہیں۔ وہ معاشی طور پر آزاد نہیں۔ وہ سب "آدمی" بن سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کسی کو آدمیوں کی فی الواقعہ ضرورت ہو۔ بغور دیکھئے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ہمارے ہاں ارباب اقتدار کا چلن (pattern) بالکل شخصی حکومت کا ہے۔ جس قدر اقتدار کسی کے ہاتھ آگیا ہے وہ اس میں کسی اور کو شریک اور سہیم نہیں بنانا چاہتا۔ بلکہ چاہتا یہ ہے کہ ادھر ادھر سے اور اختیارات بھی اسی کے قبضہ میں آجائیں۔ نتیجہ یہ کہ نظام حکومت خراب سے خراب تر ہوتا جارہا ہے۔ اور ان سے جب بھی شکایت کیجئے حکیم جی کی طرح ایک ہی جواب مل جاتا ہے کہ "آدمی نہیں ملتے"

اگر آپ دل سے چاہتے ہیں کہ پاکستان قائم ہو جائے تو بنیادی طور پر چند تبدیلیاں فوراً کرنی پڑیں گی۔

(۱) تمام صوبوں کو توڑ کر ساری مملکت کو مرکزی نظام کے ماتحت لے آیئے۔ اس سے وہ طبقہ جو محض پارٹیوں کے زور پر برسر اقتدار آگیا ہے اور اب شجر حکومت پر اکاس بیل کی طرح چھا رہا ہے۔ کہ بیل تو تر و تازہ ہو رہی ہے اور درخت دن بدن سوکھتا جارہا ہے، الگ ہو جائے گا۔ اور ساتھ ہی اخراجات حکومت میں بڑی کفایت ہو جائیگی۔

(۲) مرکزی کابینہ کو وسیع کیجئے لیکن معیار انتخاب یہ رجحان نہ قرار پائے کہ کس کے تعین سے کونسی پارٹی خوش ہوگی!

(۳) ایک ایک منسٹر کے ساتھ کم از کم چار چار، نوجوان تعلیم یافتہ، صاحب دل و دماغ، سکریٹری ملحق کر دیجئے

(۴) نئے شعبوں کو محض منسٹروں تک ہی محدود نہ رکھئے۔ پبلک میں سے صاحب درک لوگوں پر مشتمل مجالس شوریٰ متعین کیجئے تاکہ تمام امور میں منسٹروں کو مشورہ دے سکیں۔

(۵) یہ سمجھ لیجئے کہ ہم زمانۂ جنگ سے گزر رہے ہیں اس لئے کام کی رفتار اسی نہج سے مقرر کیجئے۔

(۶) مرکز کے موجودہ افسروں کو بتدریج اضلاع میں تبدیل کر کے ان کی جگہ نئے افسر متعین کیجئے۔

اطلاعات کے مطابق یہاں پارٹی بازی اس قدر شدید اور محکم صورت اختیار کر چکی ہے کہ اگر کچھ وقت اور یہی صورت حال رہی تو حکومت کی مشنری خود کارپردازانِ حکومت کے ہاتھوں سے تہس نہس ہو جائے گی۔

(۱۰) قوم، پاکستان کے تحفظ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہے۔ لیکن قوم کا اعتماد حاصل کرنے اور ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوئی کوشش اس وقت تک نہیں کی گئی۔ اس کی طرف فوری توجہ دیجئے۔

(۱۱) عسکری تربیت (ملٹری ٹریننگ) لازمی کر دیجئے۔

کوئی ہے جو دیوار پر لکھی ہوئی ان باتوں پر توجہ دے اور

پاکستان کو مستحکم کرے۔

سُن رکھئے

جنگ کی ایک خاص قسم ہے جسے اعصابی جنگ (WAR OF NERVES) کہتے ہیں۔ اس میں دشمن کرتا یہ ہے کہ چاروں طرف سے شور اور غل مچاتا ہے۔ خواہ مخواہ کھڑکھڑاہٹ پیدا کرتا ہے۔ جھوٹی دھمکیاں دیتا ہے۔ اپنی بڑی بڑی تیاریاں بتاتا ہے۔ مقصد اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ ان وحشت انگیز، ہولناک خبروں سے قومِ مخالف کے اوسان خطا ہو جائیں۔ ان میں گھبراہٹ پیدا ہو جائے۔

ہندو آجکل بالکل یہی کر رہا ہے۔ کبھی مشرقی بنگال میں شور مچاتا ہے۔ کہیں کشمیر میں اپنی فتوحات کے ڈھول پیٹتا ہے۔ کبھی پاکستان پر حملہ کرنے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ مطلب اس سب سے صرف یہ کہ پاکستان کے مسلمانوں پر خوف طاری ہو جائے اور وہ اپنے حوصلے ہار دیں۔

پاکستان کے مسلمانو! اگر تم نے ان دھمکیوں کا اثر قبول کر لیا تو دشمن اپنے حربہ میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور اگر تم نے یہ سب کچھ سن کر بھی اپنے دلوں کو مضبوط رکھا تو ہندو تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ دیکھنا کہیں اپنے اندر خلفشار نہ پیدا ہونے دینا۔ پاکستان بن چکا ہے اور انشاء اللہ قائم رہے گا۔ اقبالؒ نے سنہ ۱۹۰۴ء میں کہا تھا۔

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ طوفاں کے پار ہوگا

عدالت کا فیصلہ

"...... پھر اتنا ہی نہیں کہ ملزم نے ان بے گناہوں کی جان لے لی ہے جس طریق سے انہیں مارا گیا ہے وہ بجائے خویش ایسا سنگین جرم ہے جو انسانیت کے دامن پر شرمناک دھبہ ہے۔ ان خانماں خراب مظلوم اور بیکس انسانوں کو آٹھ آٹھ دن کا فاقہ دیا گیا۔ انہیں جنگل کی گھاس اور درختوں کے پتے کھانے پر مجبور کیا گیا۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں انہیں ننگی زمین پر بغیر کسی سائے کے تڑپایا گیا۔ سردیوں کے کپکپاتے جاڑے کی زمہریری راتوں میں انہیں کھلے آسمان کے نیچے، بغیر کسی کپڑے کے سلایا گیا۔ انہیں اس طرح قریہ بہ قریہ اور شہر بہ شہر پھرایا گیا جس طرح قلندر اپنے ریچھ اور بندروں کو لئے لئے پھرتے ہیں لیکن ان کا اتنا بھی خیال نہ کیا گیا جتنا خانہ بدوش مداری اپنے ریچھ اور بندروں کا خیال کرتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے، اس کی آنکھوں کے سامنے سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے۔ نہ ان کے بدن پر کپڑا تھا نہ پیٹ میں روٹی کا ٹکڑا۔ وہ اس کے سامنے بلبلاتے تھے اور یہ ظالم ان پر بھی رحم نہیں کھاتا تھا۔ وہ اس کی اس ستم کوشیوں کے ہاتھوں تڑپ تڑپ کر مر گئے اور اس کی آنکھوں میں ایک آنسو تک نہ آیا۔ یہ مرنے والوں کو اسی قسم کی اذیتیں دیتا رہا اور اسی طرح ان بیچاروں نے بھوک اور پیاس، گرمی اور سردی محنت اور مشقت کے عذاب سے سسک سسک کر جان دیدی۔ یہ کمبخت انسان نہیں جنگل کا درندہ ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اس لئے یہ ایسی سزا کا مستحق ہے جس کی مثال اس سے پیشتر نہ ملتی ہو اور جو آنے والوں کے لئے عبرت کا موجب بنے۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ...."

"یہ کس ملزم کا مقدمہ پیش ہے؟" ایک پناہ گزین مہاجر نے دوسرے پناہ گزین سے پوچھا۔

"ملزم کو میں نے دیکھا تو نہیں، لیکن حاکم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمارے پچھلے کیمپ کے انچارج کا مقدمہ ہے۔"

"تم بھی بالکل بیہودہ ہو وہ تو ترقی پا کر اسسٹنٹ کمشنر بن گیا ہے اور تم اس پر مقدمہ چلا رہے ہو! اس پر کون مقدمہ چلا سکتا ہے۔ مقدمہ چلتا تو اس اکیلے پر کیوں چلتا۔ نیچے سے اوپر تک سب ایک ہی رسی سے نہ باندھ دیئے جاتے؟ ہماری عدالتوں میں کسی ایک کے قتل پر مقدمہ چل سکتا ہے۔ لاکھوں کے قتل پر کوئی مقدمہ نہیں چلاتا۔ ان قاتلوں کے تو جلوس نکلتے ہیں جلوس!"

وہ ابھی اپنی بات بھی ختم نہ کرنے پایا تھا کہ ایک پولیس کے افسر نے جو ان کی باتیں سن رہا تھا، آگے بڑھ کر اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھی نے اس سے کہا کہ۔ لو بھائی!

تم تو روٹی کی فکر سے آزاد ہو گئے۔

بہار اللہ سہیلی۔

سلطنتیں ان خوشامدیوں کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں جو حکومت کو ہمیشہ اس فریب میں رکھتے ہیں کہ ان کے فیصلوں میں کوئی غلطی اور ان کے انتظام میں کہیں خرابی نہیں۔ تباہ ہونے والی حکومتیں بدبختی سے ان ہی کو پسند بھی کرتی ہیں۔

رکشا والا

"تم کہاں کے رہنے والے ہو بھائی!" میں نے حسبِ عادت رکشا والے سے پوچھا۔

"میرٹھ کے ضلع کا۔ بابو جی"

"پاکستان کب آئے؟"

"دس پندرہ دن ہو گئے۔ بابو جی۔"

"تمہارے بال بچے بھی ساتھ آ گئے ہیں کیا؟ سب خیریت سے پہنچ گئے یہاں؟"

"ان کا تو مجھے کچھ علم نہیں، بابو جی۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

"یہ تم نے کیا کہا؟ تم کہاں تھے؟ وہ کہاں ہیں؟"

"میں جیل خانے میں تھا بابو جی! مجھے پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ ہم تین تھے۔ دلی کی جیل میں تینوں بے گناہ۔ جب قیدی پاکستان آئے ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ آ گیا تھا۔ پانچ چار دن لاہور رہا۔ اب کوئی دس دن ہوئے کراچی آ گیا ہوں۔"

"تم نے اپنے گھر بار والوں کو خیریت کی خبر بھیجی ہے؟ انہیں بھی یہاں منگا لو۔ اُن کا وہاں بُرا حال ہو گا۔"

وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگ گیا۔ میں حیران تھا کہ میں نے اسے کیا کہہ دیا! اس کے زخموں کو کیوں چھیڑ دیا۔ اس نے اپنے کرتے کے پھٹے ہوئے دامن سے آنسو پونچھے اور ایک ٹھنڈی سانس لیکر بولا "میں تو خود وہیں جانے کی سوچ رہا ہوں۔ بابو جی۔ پرمٹ لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ نہیں ملا۔ اب بغیر پرمٹ کے چلا جاؤں گا۔"

"ارے کہیں ایسی غلطی نہ کر بیٹھنا۔ ہندوستان والے تو پرمٹ لیکر جانے والوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اور تم ایک تو ان کی طرف سے سزائے موت کے مجرم۔ پھر بغیر پرمٹ کے۔ وہ تمہیں فوراً گرفتار کر لیں گے اور کیا عجب کہ پھانسی دے دیں!"

"میں پھانسی کا پھندا جھیل لوں گا بابو جی! مجھ سے یہ مصیبت نہیں جھیلی جاتی۔ اس سے موت ہزار درجہ اچھی ہے" وہ پھر سسکیاں لے کر رونے لگا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں مجھ پر یہ گزرے گی! میں ورنہ وہاں کال کوٹھڑی سے کبھی نہ نکلتا۔ مجھے یہاں دس دن ہو گئے۔ کوئی شخص میرا واقف نہیں اور کسی نے ایک لفظ ہمدردی کا مجھ سے کہا نہیں۔ میں جس کی طرف بڑھتا ہوں وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور دور ہی سے دھتکار دیتا ہے۔ میں درزی کا کام جانتا ہوں۔ کوئی مجھے اپنے پاس نہیں بٹھاتا۔ بھیک نہیں مانگتا کہ اس سے بڑی شرم آتی ہے۔ بابو جی! کوئی مزدوری نہیں ملتی۔ کل سے ناچار یہ رکشا لی ہے۔ کبھی چلائی نہیں اس لئے پاؤں پر سوجن پڑ جاتی ہے۔ راستے نہیں جانتا اس لئے کسی سے ٹھیک ٹھیک کرایہ طے نہیں کر سکتا۔ اور لوگ میری اس ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اور پھر رکشہ کے مالک کے "چار روپے یومیہ" پر بھی نگاہ ڈالئے! ایک رکشا تین چار سو روپے میں بن جاتا ہے۔ چار سو روپے کے سرمایہ پر "چار روپیہ روز"! اگر مہاجن ہر روز لے تو سود خوار کہلائے۔ لیکن یہ مسلمان نام رکھنے والے قارون، چار روپے روز ہتھیالیں پھر بھی مومن کے مومن رہیں اور کسی مفتی کی بارگاہ سے ان کے خلاف کوئی فتویٰ صادر نہ ہونے پائے! اگر حکومت ان ناداروں کو چار چار سو روپیہ تقاوی کا قرضہ دے دے تو چار روپیہ روز کے حساب سے تمام رقم سوا تین مہینے میں وصول ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد رکشا مزدور کی ہو جائے۔ ازاں بعد سوا تین مہینے میں مزید چار سو روپیہ فی کس، ان غریبوں کا بینک میں جمع کر دیا جائے۔ تاکہ وہ پہلا رکشا ٹوٹ جانے کی صورت میں دوسرا رکشا بنوا سکے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہے۔ کہتے ہیں کہ کراچی میں پانچ ہزار کے قریب رکشا ہیں۔ ذرا سوچئے! ایک دن میں بیس ہزار روپیہ ان مسلمان مہاجنوں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ جو ان رکشاؤں کے مالک ہیں۔ اور معلوم ہے اس روپے کی قیمت کیا ہے؟ پانچ ہزار نونہالان ملت کی زندگیاں۔ اس لئے کہ ان کا روپیہ پورا کرنے کے لئے جن حالات میں وہ رکشا چلاتے ہیں، ارباب طب کا اندازہ ہے کہ اس سے یہ لوگ بمشکل چار یا پانچ سال تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ پھر ان کے پھیپھڑے سڑ جاتے ہیں اور وہ بن آئی موت مر جاتے ہیں۔ اس میں کچھ بھی مشکل نہیں کہ انہیں انجن سے چلنے والے رکشا بنوا کر دیئے جائیں۔ جس سے لوگوں کو بھی آرام ملے اور ان غریبوں کی زندگیاں بھی بچ جائیں۔

لیکن یہ تو اس گاڑی والے کے الفاظ میں جس کا ذکر اس سے پیشتر طلوع اسلام میں آچکا ہے۔ اس دن ہوگا۔ جب اپنی حکومت آئے گی۔ یعنی سلطانیٔ جمہور، جس کا خواب اس مرد درویش نے دیکھا تھا جس نے اس راہ گم کردہ انبوہ غنائم کو پاکستان کا تصور دیا تھا۔ ابھی تو آپ اخوت اور مساوات کے حسین الفاظ سنتے جایئے!

خدا کا فرمان

(فرشتوں سے)

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو!

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقیں سے　　کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　اقبالؒ

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

" دیانت اور ایمانداری سے کام کرو! پاکستان کو اب اپنی حکومت سمجھو!! اس کی بہبودی اور بہتری کے لئے خون پسینہ ایک کر دو!! — کان پک گئے یہ وعظ سنتے سنتے۔ تم دو دن کے لئے یہاں آکر بیٹھ جاؤ تو سمجھ میں آجائے کہ ان وعظوں کا مفہوم کیا ہے؟ پچھلے سال ہم دہلی سے لٹے ہوئے آئے۔ گھر کو آگ لگ گئی۔ سامان جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے معصوم بچوں کا گلا کٹتے دیکھا۔ بوڑھے ماں باپ کو بے گور و کفن چھوڑا۔ کسی طرح گرتے پڑتے یہاں تک پہنچے۔ نہ بدن پر کپڑا تھا، نہ جیب میں ایک وقت کے کھانے کے دام۔ اس کے باوجود، نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ کام پر لگ گئے کہ چلو۔ اپنے خون اور پسینے سے اپنی حکومت کا قصرِ رفیع الشان تعمیر کرو۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ نہ بھوک کو محسوس کیا نہ عریانی کو۔ نہ بے سر و سامانی کا گلہ کیا نہ خانماں خرابی کا شکوہ۔ دفتر میں نہ کاغذ تھا نہ قلم دوات، نہ میز تھی نہ کرسی۔ نہ کوئی انتظام تھا نہ انصرام۔ ان حالات میں اپنے خونِ جگر سے اپنی حکومت کی نقش و نگاری کی۔ لیکن اس کا نتیجہ! ہر حرام خور نے یہ سمجھ لیا کہ ایک لاڈو ٹٹو مل گیا ہے، لاد دو جس قدر لادا جا سکتا ہے۔ وہ کام سے یوں فارغ ہو کر اپنے اپنے مناصب و مدارج کی فکر میں لگ گئے۔ افسروں کے بنگلوں پر گھومے۔ ان کی بیگمات کے نجی کام سرانجام دیئے۔ بیویوں کو لیکر کلبوں میں گئے۔ اِدھر اُدھر کی پارٹی بازیوں سے اپنے ہاتھ مضبوط کئے۔ اب وہ ہمارے افسر ہیں اور ہم لادو ٹٹو سے گدھے بن چکے ہیں اور اس کے بعد ہمیں ہی دیانت اور امانت کے وعظ سنائے جا رہے ہیں"۔

ارشد یہ کہے جا رہا تھا اور میں ساکت و صامت، حیران و ششدر سن رہا تھا اور اپنے آپ پر ملامت کر رہا تھا کہ ان دُکھ سے بھرے ہوئے تاروں کو کیوں چھیڑ دیا۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ اس کے خلوص کی آئینہ دار اور اس کے الفاظ کی بیباکی اس کے صداقت کی شاہد تھی۔ میری آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں کہ میرے پاس اس کی باتوں کا کچھ جواب نہ تھا۔ میں اس سے صرف اتنا کہنا چاہتا تھا کہ اگر دوسرے لوگ کشتی کو بھنور میں چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے تو کیا تم بھی چپو چھوڑ دو گے؟ لیکن میں اتنا کہنے کی ہمت نہ پا سکا کہ دل کی آگ منطق کے پانی سے نہیں بجھا کرتی۔ اس کے زخم، عملی ہمدردی اور مثال کا مرہم چاہتے تھے جو نایاب تھا۔

چائے کا دور

چل رہا تھا ۔۔ خوش گپیوں کی محفل گرم تھی ۔ شگفتہ قہقہے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے ۔ گفتگو بالکل بے تکلفانہ تھی ۔

اختر نے سلام سے پوچھا ۔

"اب کے لاہور سے کیا مال لائے ہو" ؟ سلام نے جواب دیا ۔

تین چار ٹرنک مختلف اشیاء کے لا سکا ہوں ۔

زیادہ کیوں نہیں لائے ؟ اختر نے پوچھا

ریل کی بک بک ، چنگی والوں کی مصیبت ! کوئی ایک مشکل ہے ۔ سلام نے جواب دیا ۔

محصول چنگی کتنا دیا ؟ اختر نے پوچھا ۔

محصول چنگی ! محصول دیتا تو اتنا نفع کہاں سے ہوتا ۔ جب میں چنگی خانہ کے سامنے سے گزرا ہوں تو چنگی کے جمعدار نے فوراً بھانپ لیا ۔ معلوم نہیں ان کمبختوں کو ٹرنک کے اندر چھپے ہوئے مال کا کس طرح پتہ لگ جاتا ہے ۔ میں نے ہزار کہا کہ یونہی گھر کا متفرق سامان ہے لیکن اس نے ایک نہ مانی ۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر حساب کیا گیا تو کم از کم پچاس روپے دینے پڑیں گے ۔ میں نے پانچ کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور چلتا بنا ۔ آج کل تو یونہی کام چلتا ہے !

ایک سلام پر ہی کیا موقوف ہے آج کل ہر شخص یہی کر رہا ہے اور جو ایسا کر نہیں سکتا اس کی بھی خواہش یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح موقع لگے تو میں بھی ایسا ہی کروں ۔

چھوڑیئے اس چیز کو کہ یہ بات اخلاقاً کیسی معیوب ہے ۔ اس لئے کہ اگر ہمارے پاس اخلاق ہوتے تو ہم ایسی ذلت کی زندگی کیوں بسر کر رہے ہوتے ۔ لیکن کم از کم اتنا سوچئے کہ اس سے تم اسی شاخ کو کاٹ رہے ہو جس پر تم خود بیٹھے ہو ۔ اسی کشتی میں سوراخ کر رہے ہو جس میں تم نے دریا کو پار کرنا ہے ۔

جو روپیہ حکومت کے خزانہ میں جائے گا وہ پاکستان کے استحکام میں صرف ہوگا ۔ اور پاکستان کے استحکام سے خود تمہاری زندگی اور ناموس وابستہ ہے ۔ یہ کمزور ہو گیا تو تم بھی ختم ہو جاؤ گے ۔ ذرا سوچو کہ یہ خیانت تم کس سے کر رہے ہو ؟ کیا اپنے آپ سے ہی نہیں ؟

شاعری نے مار ڈالا اس قوم کو!

"مسلمانو! تمہاری رگوں میں خون نہیں، تڑپنے اور جلنے والی بجلیاں ہیں جو باطل کے خس و خاشاک کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیں گی۔ تمہارے سینے متاعِ ملی کے امین ہیں۔ دنیا کی کوئی قوت اس امانت کو تم سے چھین نہیں سکتی۔ ہم نے دنیا کے روباہ بازانِ ازلی سے بار بار کہا کہ اس شیر نیستان کو سویا رہنے دو، اسے مت چھیڑو۔ یہ جاگ اٹھا تو دنیا میں قیامت برپا کر دے گا۔ پھر تمہیں نہ زمین میں پناہ ملے گی نہ آسمان پر۔ لیکن ان ناعاقبت اندیشوں نے ہماری اس پکار کو محض ہنسی سمجھا اور اس اسدِ بیشۂ حریت و بسالت کو جگا کر چھوڑا۔ مسلمانو! اس چیلنج کو قبول کرو۔ اٹھو بیدار ہو جاؤ۔ اور باطل کی قوتوں کو بتا دو کہ

"آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا"

آپ کسی جلسے میں جائیے۔ ہر تقریر اسی قسم کی شعلہ فشانیوں سے فضا کو معمور کرتی دکھائی دے گی۔ آپ گھنٹوں سنتے جائیے۔ ہر روز سنئے۔ کہیں سنئے، کسی سے سنئے۔ چند الفاظ ہوں گے طنطنہ خیز اور چند فقرے ہوں گے ولولہ انگیز۔ اور اس کے بعد کچھ نہیں۔ کوئی انہیں یہ نہیں بتلائے گا کہ وہ بالآخر کیا کریں؟ کسی مقرر کے سامنے کوئی اسکیم نہیں ہوگی کوئی تدبیر نہیں ہوگی۔ کوئی عملی تجویز نہیں ہوگی۔ نتیجہ یہ کہ قوم بھی ان چٹپٹے دار تقریروں کی عادی ہو گئی ہے۔ وہ جلسے اور مشاعرے میں کوئی فرق نہیں سمجھتی۔ تھوڑے وقت کے لئے دل بہلانے کا سامان۔ یونہی دفع الوقتی اور بس۔ دل لرز اٹھتا ہے یہ سوچ کر کہ بالآخر اس شاعروں کی قوم کا کیا حشر ہونے والا ہے؟ کیا اس ہجوم انام میں ایک بھی "رجل رشید" نہیں جو انہیں کوئی کام کی بات بتائے اور انہیں راستہ پر لگائے؟ لفظوں سے محلات تعمیر کر دینے والے ہزاروں نظر آتے ہیں۔ عملی اسکیم سے بنیاد رکھنے والا کوئی نہیں ملتا۔ تم جس جلسے میں جاؤ مقرر سے کہدو کہ "ہم سے دو ٹوک بات کرو اور سیدھے سادے لفظوں میں یہ بتاؤ کہ ہم کیا کریں اور کیسے کریں! اس سے زیادہ ہم کچھ سننا نہیں چاہتے"۔ آپ دیکھیں گے اس بے معنی تقریر بازی کا سلسلہ کتنی جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہی سامنے آنے کی جرأت کرے گا جس کے پاس واقعی کوئی تعمیری پروگرام ہوگا۔

مجلس دستور ساز کے اراکین سے

مہذب اور وحشی ملک میں فرق یہ ہوتا ہے کہ مہذب ملک کا نظام ایک متعینہ آئین کے مطابق چلتا ہے۔ اور وحشی ملک کا آئین متعین نہیں ہوتا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے بنیادی سوال، تدوینِ آئین کا تھا تاکہ یہ سرزمین بے آئین نہ رہنے پائے۔

یہ تھا وہ اہم فریضہ جو آپ حضرات کے سپرد کیا گیا۔

کیا آپ سے قوم باادب پوچھ سکتی ہے کہ آپ نے اس فریضہ کی انجام دہی میں اس وقت تک کیا کیا؟

اور اگر کچھ نہیں کیا تو آپ کے پاس اس کی کوئی معقول وجہ بھی ہے؟

معاف فرمایئے؛ اگر آپ میں تدوینِ آئین کی اہلیت نہیں تو کھلے بندوں اس کا اعتراف کیجئے اور یہ فریضہ دوسروں کے سپرد کیجئے جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔

اور اگر آپ میں اہلیت ہے لیکن محض اپنے تساہل یا تغافل کی وجہ سے آپ اس فریضہ کو سرانجام نہیں دے رہے تو یہ تغافل مجرمانہ ہے۔ اس کی جواب دہی کے لئے کسی عدالت کے کٹہرے میں آجایئے۔

اور اگر آپ اس سے مطمئن ہیں کہ آپ سے کوئی بازپرس نہیں کر سکتا تو اس جھوٹے اطمینان میں نہ رہیئے۔ فطرت کے قانون کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ

وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (۴۷/۳۸)

اگر تم (اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے) روگردانی کرو گے تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئیگا جو تمہارے جیسی (نااہل) نہیں ہوگی

اتاترک کا آخری پیغام

"ترکی کے نوجوانو! تمہارا اولین فریضہ ترکی کی آزادی کا تحفظ ہے۔ اسی پر تمہاری ہستی اور مستقبل کی بنیاد ہے۔ یہی تمہاری بیش بہا متاع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد تم میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں یا بیرونی قوتیں یہ مشئوم ارادہ کر لیں کہ تمہیں اس متاعِ گراں بہا سے محروم کر دیا جائے۔ اس لئے اگر کسی ایسے دن تمہیں پکارا جائے کہ آؤ۔ اپنی آزادی کے تحفظ کا سامان کرو۔ تو تمہیں اس آواز پر فوراً لبیک کہنا ہوگا۔ بے تامل اور بے توقف لبیک۔ خواہ حالات کیسے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں۔

شاید حالات اس درجہ ناسازگار ہو جائیں کہ خود تمہاری عزت بھی معرضِ خطر میں ہو اور جو لوگ تمہاری آزادی کو سلب کرنا چاہتے ہیں، انہیں ایسی ایسی فتوحات حاصل ہو جائیں کہ جنکی مثال نہ ملتی ہو۔ ملک کے تمام قلعے تمہارے ہاتھوں سے نکل جائیں۔ تمام اسلحہ خانے دشمن کے قبضہ میں چلے جائیں۔ ہمارے تمام لشکر منتشر ہو جائیں اور دشمن ملک کے کونے کونے پر مسلط ہو جائے۔ نہیں: بلکہ حالات یہاں تک مایوس کن ہو جائیں کہ خود تمہارے اربابِ اقتدار ملک کی حفاظت کی طرف سے بے پرواہ اور بے راہ رو ہو جائیں اور وہ اپنے مفاد کو خود حملہ آوروں کے مفاد سے منسلک کر لیں۔ درانحالیکہ قوم بھوک اور فلاکت سے دم توڑ رہی ہو۔

لیکن اے ترکی مستقبل کے جاں باز بچو! ایسے حوصلہ شکن اور روح فرسا حالات میں بھی تمہارا فریضہ یہی ہونا چاہیئے کہ تم ترکی کی آزادی کو بچاؤ۔ اس کے لئے تمہیں جس قوت کی ضرورت ہے وہ کہیں باہر سے نہیں آئے گی، وہ اس خون میں موجود ہے جو تمہاری رگوں میں موجزن ہے۔"

پاکستان کے شاہین بچو! اتاترک کا یہ پیغام تمہارے لئے بھی ہے۔ اگر تم نے بھی اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنا سیکھ لیا تو تم دیکھ لوگے کہ حالات کس طرح خود بخود سازگار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہندو قوم۔ ہر صاحبِ فکر کے لئے ایک معمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پرانے واقعات کو چھوڑ کر صرف تقسیمِ ہند کے بعد کے معاملات کو لیجئے تو آپ حیرت میں رہ جائیں گے کہ اس قوم کے متعلق دنیائے اصول و اخلاق میں کیا رائے قائم کی جائے! ان کے بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھئے تو ان کے قول و عمل میں کوئی موافقت نہیں ہوتی۔ وہ زبان سے کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں ان کی تقریریں سنئے تو وہ اپنے آپ کو ست (سچائی) کے دیوتا، اہنسا (عدم تشدد) کے پجاری، نیائے (انصاف) کے شردھالو (عقیدتمند)، اتیاچاری (ظلم) کے سب سے بڑے دشمن، بتائیں گے اور اس کا دعویٰ کریں گے کہ ان کا مشن دنیا میں پریم اور شانتی (محبت اور امن) کا پرچار (تبلیغ) اور رام راج (رضا کی حکومت) کا قیام ہے۔ وہ رام راج جو بلند ترین اخلاق اور زریں اصولاتِ زندگی کا ذمہ دار ہے اور جس میں ہر سانس لینے والا جیو (روح) سچی آزادی سے لذت اندوز ہوتا ہے۔ اس کا نام وہ پراچین (قدیم ہندو) تہذیب بتاتے ہیں۔ جسے دیوتاؤں نے قائم کیا اور ایشور کے اوتاروں نے پروان چڑھایا۔ اسی تہذیب کی احیاء، ہندوستان کی نئی حکومت کا فریضہ ہے۔ یہ کچھ ہے جو وہ زبان سے کہتے ہیں۔ بنارس کے مندروں میں، دہلی کی جامع مسجد میں، لندن کے ایوانِ شاہی میں، اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں، ہر جگہ ان کے نمائندے ان ہی اصولوں کو دہراتے اور ان ہی مقاصد کا اعلان کرتے نظر آئیں گے۔ لیکن اس کے برعکس۔ ان کے گزشتہ ڈیڑھ سالہ اعمال پر غور کیجئے تو صاف نظر آجائے گا کہ ان کا نہ کوئی اصول ہے نہ دھرم، نہ دین ہے نہ ایمان، نہ انہیں کبھی اپنے وعدہ کا پاس ہوتا ہے نہ معاہدہ کا خیال، نہ سچائی سے کچھ علاقہ ہوتا ہے نہ انصاف سے کوئی واسطہ۔ وہ اپنی مقصد براری کے لئے ہر حیلہ کو جائز اور اپنی کامیابی کے لئے ہر طریق کو درست سمجھتے ہیں اور اپنے کئے پر نہ کبھی متاسف ہوتے ہیں نہ پشیمان۔ کھلے بندوں وعدہ خلافی اور فریب کاری کئے جاتے ہیں اور زبان سے ست، اہنسا، ایشور بھگتی کی مالا بھی جپتے جاتے ہیں۔ دنیا اس معمہ کے حل کرنے سے قاصر تھی کہ اس قوم کے قول اور عمل میں ایسے کھلے ہوئے تضاد کی علت کیا سمجھی جائے۔ لیکن اسے شکرگزار ہونا چاہیئے ہندوستان کے ہائی کمشنر متعینہ پاکستان (مسٹر سری پرکاش) کا جنہوں نے اس معمہ کو حل کر کے دنیا کو ایک بہت بڑی ذہنی پریشانی سے نجات دلا دی۔ انہوں نے ۱۶ر نومبر کی شام، تھیوسوفیکل سوسائٹی (کراچی) کے ہال میں ایک تقریر فرمائی جس کا عنوان تھا۔

"ہندو مت ، ایک ضابطہ اخلاق کی حیثیت سے" اس تقریر میں انہوں نے بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتایا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندو مت کوئی مستقل اخلاقی ضابطہ متعین کرتا ہے، جس پر سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے، وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہندو مت انسانی زندگی کے لئے کوئی غیر متبدل اصول واقدار پیش نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ہر موقع اور ہر مقام کے لحاظ سے مختلف اصول وضع کرتا ہے جو ایک دوسرے سے یکسر متضاد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ سوسائٹی کے ایک طبقہ (براہمنوں) کو اہنسا (عدم تشدد) کی تعلیم دیتا ہے تو دوسرے طبقہ (کھشتریوں) کو قتل و خون ریزی سکھاتا ہے۔ یا مثلاً وہ پنڈتوں سے کہتا ہے کہ سچ بولو لیکن ویش (تجارت پیشہ لوگوں) کو کبھی اس کا پابند نہیں ٹھہراتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سچ بولنے سے تجارت میں نقصان ہوتا ہے اس لئے وہ واضح الفاظ میں انہیں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے اور آگے بڑھئے۔ وہ ایک برہمن کو صرف سنیاس (ترک دنیا) کی حالت میں اہنسا اور ست کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہی براہمن جب گرہست آشرم (اہل وعیال کی زندگی) بسر کر رہا ہو تو وہ اسے ان اصولوں کا پابند نہیں ٹھہراتا۔ مختصراً یہ کہ وہ اگر ایک قسم کے حالات میں سچ اور دیانت کی تاکید کرتا ہے۔ تو دوسری قسم کے حالات میں جھوٹ اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے مسٹر سری پرکاش نے اپنے ان دعاوی کی دلیل میں اپنی مقدس کتابوں سے بطور سند اشلوک بھی پڑھ کر سنائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہندومت میں کوئی اصول زندگی قطعی (ABSOLUTE) نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر سچائی اور دیانت سے کام چل ہی نہیں سکتا اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت، ہزارہا سال سے، مختلف حالات اور متبائن ماحول میں زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔

مسٹر سری پرکاش کے اس "بیباکانہ اعتراف حقیقت" کو پیش نظر رکھئے اور پھر سوچئے کہ ہندو لیڈروں کے قول اور عمل میں ایسا کھلا ہوا تضاد کیوں ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی ساری تاریخ میں صرف ایک سیاستدان کا نام آتا ہے جو "ارتھ شاستر" کا مصنف ہے۔ اس کا اصلی نام چانکیہ تھا۔ لیکن اس نے اپنا تصنیفی نام "کاٹلیہ" رکھ لیا تھا، جس کے معنی مسٹر نارائن چندر باد یو پادھیائے "فریب کار" کے لکھتے ہیں۔ یورپ کے مورخ کاٹلیہ کو ہندوستان کا میکیاولی کہتے ہیں، جس کا مشہور فلسفۂ سیاست یہ ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے جو ذرائع بھی ضروری سمجھے جائیں بے محابا استعمال کر لینے چاہئیں۔ اگر آپ اپنی مقصد براری میں کامیاب ہو گئے تو یہ سب ذرائع جائز اور درست سمجھے جائیں گے۔ میکیاولی کا فلسفۂ سیاست مدن، اقوام یورپ کے لئے "صحیفۂ آسمانی" کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جس کے حامل برملا کہتے ہیں کہ "میں اخلاقیات کا قائل ہوں۔ لیکن قوموں کے معاملے ان اصولوں کی رو سے طے نہیں پایا کرتے" (Lord Grey) یا یہ کہ "ملکوں کی حفاظت شریف انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ

شریف انسان اس حد تک نہیں جا سکتے جو مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے" (Walpole) - ہندوؤں کا مذہب وہ ہے جس کی وضاحت مسٹر سری پرکاش نے فرمائی ہے - اور سیاست پران کے استاد وہ جن کے اقوال اوپر درج کئے گئے ہیں - یہ ہے وہ قوم جس سے، بدقسمتی سے، پاکستان کا چولی دامن کا ساتھ ہے - تقسیم ہند سے متعلق معاہدت و مفاہمت کی جس انداز سے اس قوم نے مٹی پلید کی ہے اس میں انہوں نے اپنے استادوں کے بھی کان کتر دیئے ہیں - پھر اس کے بعد، ریاستوں کے معاملہ میں انہوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے، اس کی مثال بھی بمشکل کہیں اور مل سکے گی - غور کیجئے جوناگڑھ کے نواب نے پاکستان سے الحاق کیا تو یہ اس ریاست پر چڑھ دوڑے کہ نواب کا فیصلہ کوئی فیصلہ نہیں - وہاں کی آبادی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے اس لئے ہمیں حق حاصل ہے کہ ہم اس ریاست کو ہتھیا لیں - دوسری طرف کشمیر تھا جہاں مسلمانوں کی آبادی اسی فی صدی سے بھی زیادہ ہے لیکن کشمیر پر قبضہ کرنے کی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہاں کے راجہ نے ہندوستان سے الحاق کر لیا ہے - حیدرآباد میں الحاق اور عدم الحاق کا سوال ہی نہیں اٹھایا گیا - وہاں جارحانہ فوجی اقدام سے اپنا تسلط جما لیا گیا ہے - ایک طرف یہ سب کچھ کئے جا رہے ہیں اور دوسری طرف شور مچائے جا رہے ہیں کہ پاکستان بڑی زیادتی کر رہا ہے - ہم مجبور ہو جائیں گے کہ اس کے خلاف کھلی ہوئی فوجی کارروائی کریں! پاکستان کا مسلمان حیران ہے کہ ـــ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ - اور لِمَ اس کی وجہ ہے جس کی نقاب کشائی مسٹر سری پرکاش نے اپنی تقریر میں کی ہے -

ان ہی سری پرکاش صاحب کو دیکھئے - یہ کلکتہ گئے تو ایک قیامت برپا کر دی کہ مشرقی پاکستان میں مسلمانوں نے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے جس کی وجہ سے وہاں کی ہندو آبادی موج در موج ہندوستان کی طرف بھاگ رہی ہے -

"دیوانہ را ہوئے بس است" پٹیل صاحب دہلی سے چلا اٹھے کہ اگر پاکستان نے ہندوؤں کو ہندوستان آنے سے نہ روکا تو ہم ان کے لئے، سرزمین پاکستان سے ایک علاقہ کا مطالبہ کریں گے اور اگر پاکستان اس سے انکار کرے گا تو اس پر چڑھائی کر دیں گے - مشرقی بنگال سے ہندوؤں کی اس نقل مکانی کی وجوہات کیا تھیں، اس کے متعلق ایک ہندو کی زبان سے سنئے - ہندوستان ٹائمز کا نامہ نگار، جس نے ان علاقوں کا خود دورہ کیا ہے، لکھتا ہے -

> اگرچہ وہاں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا، لیکن بعض ہندوؤں نے مجھے بتایا کہ مسلمانوں کا سلوک کچھ طعن آمیز سا ہے - مشرقی بنگال کا متوسط طبقہ ایک روشن خیال طبقہ ہے - جس نے اپنے کلچر، تعلیم، اور ایثار سے صوبہ میں سیاست مدن کی روایات قائم کی ہیں - اس صوبہ کے لوگ اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ یہاں کے نوجوان ہندوؤں نے آزادی وطن کی تحریک میں بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں - وہ اب اس (مسلمانوں کی حکومت کے زیرِ تابع) زندگی سے کبھی مفاہمت نہیں کر سکتے جسے وہ ذلت آمیز سمجھتے ہیں" (ہندوستان ٹائمز ۱۱/۱۰)

غور فرمایا آپ نے: خود ہندو نوجوانوں کا طبقہ مسلمانوں کی حکومت کے خلاف خلفشار پیدا کر رہا ہے اور (بقیہ دیکھئے صفحہ ۴۲ پر)

عَالَمِ اسلام

عقائد

محترم پرویز صاحب کی تقریر جو انہوں نے ۲۰ نومبر کی شام کراچی سے نشر کی اور جسے پاکستان ریڈیو کی اجازت سے بمسرت شائع کیا جاتا ہے۔ تقریر بڑے غور و فکر سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔ اس کی اشاعت تمام ممالک اسلامیہ میں ہونی چاہیئے۔ یہ حکومت کے کرنے کے کام ہیں لیکن ان کے ہاں ابھی ان چیزوں کی شاید ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ (طلوعِ اسلام)

انسان نے جب دیکھا کہ وہ ان مخالف قوتوں کا جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں، اکیلا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس نے اکٹھے مل کر رہنے کا انداز زندگی اختیار کیا۔ یہیں سے خاندان کی بنیاد پڑی۔ خاندان پھیل کر قبیلہ کی شکل اختیار کر گیا اور قبائل پھیلے تو اقوام بن گئے۔ اجتماعی زندگی کی ابتدا ہوئی تھی اس ضرورت کے ماتحت کہ کس طرح غیر انسانی قوتوں سے مدافعت کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ مثلاً جنگل کے درندے۔ یا ارضی و سماوی آفات و حادثات وغیرہ لیکن جب باہمی مفاد کا تصادم ہوا تو خود ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بن گئی بعضکم عدوّ لبعض پھر اشتراک مفاد کے ماتحت ایسا بھی ہوا کہ کچھ خاندان ایک طرف اور کچھ دوسری طرف ہو گئے بعض قبائل نے باہمی اتحاد سے دوسرے قبائل کے مقابل متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ کچھ اقوام باہمی معاہدات سے ایک گروپ میں شامل ہو گئیں اور دوسری اقوام، فریق ثانی بن گئیں۔ انسانی زندگی کی ساری تاریخ پر غور کیجئے۔ وہ اسی قسم کی گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کی مسلسل داستان نظر آئے گی حتیٰ کہ آج بھی، جبکہ انسان بزعم خویش، فلسفۂ اجتماع اور سیاست مدن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکا ہے، اقوام عالم ان ہی گروہ سازیوں کی ادھیڑ بن میں مصروف تعمیر و تخریب ہیں۔ قومیت کی بنیاد آج بھی اسی طرح خون۔ رنگ۔ نسل۔ زبان۔ وطن کے اشتراک پر ہے جس طرح انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں تھی۔ صدیوں کے تجربہ اور قرنہا قرن کے علمی سرمایہ کے باوجود، یہ ان حدود سے بلند نہیں ہو سکا اور اس کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔

لیکن آج سے چودہ سو سال پیشتر دنیا میں ایک تحریک اٹھی جس نے انسانی اجتماعیت یا قومیت کی بنیاد نسل، زبان، یا وطن کے اشتراک کے بجائے، وحدت خیال و فکر پر رکھی جسے مذہب کی زبان میں عقائد اور دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں Ideology کہا جاتا ہے۔ قومیت کا یہ تصور، انسانی تاریخ میں ایک بہت بڑے انقلاب کا موجب تھا۔ اس جدید تصور کے ماتحت سرزمین حجاز میں ایک نئے انداز کی قوم وجود میں آئی۔ جو دنیا میں ملت اسلامیہ

متعارف ہوئی۔ اس قوم کے اجزائے ترکیبی ان متضاد اور متخاصم عناصر پر مشتمل تھے جو دنیا کے تصورِ قومیت کے ماتحت کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے تھے۔ حبشہ کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، فارس کے سلمانؓ، عرب کے ابوبکرؓ خون، رنگ، نسل، زبان اور وطن کی وحدتوں کو توڑ کر اس نئی قوم کے افراد بنے جن میں وجہ جامعیت صرف وحدتِ ایمان تھی۔ ان کے برعکس خود مکہ کے قریش جو اس وحدتِ عقائد میں شریک نہ ہوئے تھے، قریب ترین رشتہ دار ہونے کے باوجود، دوسری قوم کے افراد تھے جو فریق مقابل کی حیثیت رکھتی تھی۔ بدر کے میدان نے، کہ جسے قرآن نے اسی جہت سے یوم الفرقان کہا ہے، قومیت کے اس نئے فرق کو نمایاں طور پر اپنے سامنے دیکھ لیا، جب کیفیت یہ تھی کہ باپ ایک طرف تھا اور بیٹا دوسری طرف، ایک بھائی ایک طرف تھا اور دوسرا بھائی دوسری طرف، ماموں ادھر تھا اور بھانجا اُدھر، چچا اُدھر تھا اور بھتیجا اِدھر۔ داماد ایک طرف تھا اور خسر دوسری طرف۔ قومیت کا یہی وہ جدید تصور تھا جسے دنیا آج تک نہیں سمجھ سکی۔ اور اسی کی وجہ سے وہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیوں میں گرفتار چلی آرہی ہے۔

اس تصور میں بنیادی عقیدہ توحید کا ہے۔ یعنی اس پر ایمان کہ کائنات کا خالق، زندگی کا سرچشمہ اور تمام نظامِ عالم کا حاکم مقتدر خدائے واحد القہار ہے۔ وحدتِ خالق کے اسی بلند و بالا عقیدہ سے وحدتِ خلق کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے یعنی یہ عقیدہ کہ جب زندگی کا سرچشمہ ایک ہے تو زندگی کے مظاہر بھی اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے برابر ہیں۔ یہی عقیدہ مساوات انسانی اور احترام آدمیت کی بنیاد ہے جس پر دنیا کی امن و سلامتی کا مدار ہے۔

لیکن صرف خدا کی ہستی کا اقرار نہ انسانی ہدایت کے لئے کافی ہوسکتا ہے نہ اس سے قومیت کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ دنیا میں سوائے چند دہریوں کے، سب خدا کی ہستی کا، کسی نہ کسی شکل میں، اقرار کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس کے باوجود قومیت کے اس جدید تصور کے ماتحت جسے اسلام نے پیش کیا ہے، ایک قوم کے افراد نہیں بن سکتے۔ قومیت کی تشکیل کے لئے رسالت پر ایمان ضروری ہے۔ ملت اسلامیہ محمدؐ رسول اللہ پر ایمان رکھنے کی بنا پر ایک جداگانہ امت قرار پاتی ہے، صرف خدا پر ایمان رکھنے کی بنا پر نہیں۔ ختم نبوت کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ ملت شریفہ قیامت تک ایک مستقل اور جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہیگی۔ جس طرح ایک عیسائی محمدؐ رسول اللہ پر ایمان لے آنے سے ملت نصرانیہ سے کٹ کر ملت اسلامیہ کا فرد بن جاتا ہے، اسی طرح اگر ایک مسلمان، رسول اللہ کے بعد کسی اور رسول پر ایمان لے آئے تو وہ ملت اسلامیہ سے الگ اس دوسری ملت کا فرد قرار پا جائے گا، جو اس رسول کی نسبت سے وجود میں آئیگی۔ اس لئے اس تصورِ قومیت کی بنا پر جسے اسلام نے پیش کیا ہے، توحید کے بعد رسالت حضور ختم المرسلینؐ پر ایمان ضروری ہے۔

لیکن رسول پر ایمان سے مفہوم اس کی ذات پر ایمان نہیں، کیوں کہ اس کی ذات تو مکان اور زمان کی حدود کی پابند ہوتی ہے۔ اور ملت اسلامیہ جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے۔ ابدیت سے ہمکنار ہے۔ اس لئے رسالت محمدیہ پر ایمان سے مقصود اس کتاب پر ایمان ہے جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی اور جو قیامت تک، تمام نوع انسانی کے لئے ضابطہ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی رو سے کتاب کے بغیر رسول کا تصور ہی غلط ہے۔ لہٰذا ملت اسلامیہ...

ــه یہ تین سطریں بطور تشریح اضافہ ہیں۔

کے لئے وجہ جامعیت اور بنیاد قومیت، قرآن کریم ہے جو ان کے فکر و عمل میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دنیا نے خون، رنگ، نسل، زبان اور وطن کے علاوہ، اشتراکِ حکومت کو بھی قومیت کا مدار قرار دیا ہے۔ یعنی ایک حکومت کے تابع تمام افراد ایک قوم بن جاتے ہیں۔ اسلام کی رو سے کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں۔ انسانوں پر حکومت صرف خدا کی جائز ہے جس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام انسان اس قانون کے تابع رہیں جو خدا نے انسانوں کیلئے متعین کیا ہے اور جو اصولی طور پر قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ لہٰذا ملتِ اسلامیہ قرآن کی اتباع سے ایک منفرد اور مستقل قوم بنتی ہے۔ دنیا کا کوئی انسان، وہ کسی ملک کا باشندہ ہو، کسی نسل سے متعلق ہو، اس کی ذات اور برادری کچھ ہو، وہ کوئی زبان بولے، وہ سیاہ فام ہو یا سفید رنگ، جب اس امر کا اقرار کرے کہ وہ اپنی زندگی کو قرآنی قوانین کے تابع رکھے گا، تو وہ دنیا کی تمام نسبتوں سے کٹ کر اس جدید قوم کا فرد بن جائے گا جسے امتِ مسلمہ کہا جاتا ہے۔ اس امت کی ہیئتِ اجتماعیہ کا مرکز اور محور قرآن پر عمل ہو گا اور وہ اپنے ہر فیصلہ میں اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھے گی جس کا قانونِ مکافاتِ عمل دل کے ارادوں اور نگاہ کی جنبشوں تک کو محیط ہے اور جس کی رو سے زندگی کا رشتہ، سانس کی آمد و رفت تک ہی محدود نہیں، اس سے آگے بھی مسلسل چلتا ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف کا نام، ایمان بالآخرت ہے۔

یہ ہیں عقیدہ یا [illegible] کے وہ اجزائے ترکیبی جن سے اسلامی قومیت صورت پذیر ہوتی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جدید تصور کے مطابق اسلامی قومیت کی تشکیل سے مقصود کیا ہے؟ جیسا کہ شروع میں بیان کیا جا چکا ہے انسان کے لئے اجتماعی زندگی بسر کرنے کا محرک جذبہ یہ تھا کہ وہ ان خطروں کے شر سے محفوظ رہے جو اس کی ہلاکت کے موجب ہیں۔ تو کیا اسلامی قومیت سے بھی یہی مفہوم ہے کہ اس اجتماعی حصار کے اندر افراد کی زندگی محفوظ رکھی جا سکے؟ اس میں شبہ نہیں کہ تحفظِ ذات نہایت ضروری ہے اور اس کا جذبہ ہر ذی حیات کی فطرت میں داخل ہے لیکن اسلام کی رو سے محض زندہ رہنا مقصودِ زندگی نہیں ہے۔ اگر محض زندہ رہنا ہی مقصدِ زندگی ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کاروانِ حیات، پیکرِ انسانی میں پہنچ کر اپنی آخری منزل میں آ گیا ہے اور اب اس کی مزید ترقیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ نظریہ اسلام کی تعلیم کے منافی ہے۔ قرآن کی رو سے زندگی کا تصور حرکیاتی [illegible] ہے جمود [illegible] نہیں۔ اس لئے زندگی کا کسی مقام پر بھی آگے بڑھنے سے رک جانا اس کے نزدیک زندگی کی فطرت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اسلامی قومیت سے مقصود ایک ایسی ہیئتِ اجتماعیہ کی تخلیق ہے جو انسانیت کے قافلہ کو آگے بڑھاتی لئے چلی جائے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ اس جماعت کی پوزیشن ایسی ہو کہ یہ تمام دنیا کے انسانوں کے اعمال کی نگران ہو اور ان پر نگۂ احتساب رکھ سکے۔ قرآن نے ملتِ اسلامیہ کے اسی منصب کو شہداء علی الناس کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ نگرانی اور احتساب اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ قوم تمام اقوامِ عالم سے زیادہ طاقتور اور انسانیت کی بلند ترین سطح پر ہو۔

یہ تھی وہ قوم جو انسانیت کے معلمِ اعلیٰ جناب محمد رسول اللہ کے انسان ساز ہاتھوں سے وجود میں آئی۔ وہ قوم جس کی تخلیق وحدتِ افکار و کردار پر ہوئی تھی اس لئے اس میں کوئی اختلافات اور کسی قسم کا تفرقہ نہیں تھا۔ کیا خشوع و [illegible]

اس کے قوام کے منافی تھا۔ لیکن تاریخ اس سے بڑی بوالعجبی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ یہی قوم آج دنیا میں سب سے زیادہ اختلافات کی مظہر اور تفرقہ انگیزی کا پیکر ہے۔ اس قوم کی بنیاد عقیدہ کی وحدت پر تھی لیکن عقائد ہی کے اختلافات سے ان میں کہنے کو بہتر اور درحقیقت تہتر سو فرقے موجود ہیں۔ اس قوم کی تشکیل، وطنی اور نسلی امتیازات کو مٹا دینے سے ہوئی تھی۔ لیکن آج وہی ملت واحدہ، نسلوں اور وطنوں کے اختلاف سے سینکڑوں اقوام میں بٹ چکی ہے اور اب یہ نوبت کہ ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ اور ایک قوم کو دوسری قوم سے بُعد و مغائرت ہی نہیں بلکہ عداوت اور مخاصمت ہے۔ دنیا کی قومیں، وطنی اور نسلی امتیازات کے مہلک نتائج سے تنگ آ کر عقیدہ یعنی (Ideology) کی بنا پر قومیت اور حکومت کی ترتیب نو کی تجویزیں سوچ رہی ہیں۔ اشتراکیت (Communism) یا عالمگیریت (Universalism) کی تحریکیں اسی زاویہ نظر کی ترجمان ہیں۔ ہمیں سردست اس سے بحث نہیں کہ یہ عقائد صحیح ہیں یا غلط۔ اس وقت کہنا صرف یہ ہے کہ دنیا اب آہستہ آہستہ، وحدت فکر و نظر کی بنا پر تشکیل قومیت کی طرف آ رہی ہے اور دنیا کے مسلمان۔ جو محض وحدت فکر و نظر کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد تھے۔ اپنی قومیتوں کا مدار نسلوں اور وطنوں پر رکھے ہوئے ہیں۔ یقیناً سورج کی آنکھ نے اس سے بڑا تغیر کہیں نہیں دیکھا۔ سنی، شیعہ، حنفی، مالکی، مقلد، غیر مقلد یا ایرانی، تورانی، مصری، شامی، افغانی، ہندی کے الفاظ اسلام کے لغت میں کہیں نہیں ملتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایرانی، افغانی وغیرہ امتیازات بغرض تعارف روا رکھے جا سکتے ہیں لیکن ان کا مدار قومیت قرار پا جانا یکسر خلاف اسلام ہے۔ مسلمان کی قومیت جغرافیائی حدود سے نہیں، وحدت ایمان سے متعین ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک دنیا میں قومیں صرف دو ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم هو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مؤمن (۶۴/۲)، نہ ہی اسلام میں کوئی فرقہ ہو سکتا ہے کہ فرقہ سازی قرآن کی رو سے شرک ہے وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ حالت تشتت و افتراق سے۔ جب مسلمان بے شمار فرقوں اور متعدد قوموں میں بٹ چکا ہے۔ اس حالت کی طرف کیسے لوٹا جا سکتا ہے۔ جب یہ ایک ہی جماعت اور ایک ہی قوم تھے۔ یہ چیز نہ تو مناظروں اور مباحثوں سے ہو گی اور نہ ہی اقوام مسلم کے باہمی روابط و اتحاد کی تحریکوں سے۔ یہ ہو گی اسی طرح سے جس طرح سے پہلی بار ہوئی تھی۔ ان کے خدا نے ان کی وحدت کے لئے ایک ہی طریقہ بتایا تھا اور وہ یہ تھا کہ واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا۔ تم سب، تمام کے تمام، بلا تفریق رنگ و نسل، قرآن کو اپنی حیات اجتماعیہ کا مرکز مقرر کر لو۔ اسی سے تمہارے قلوب میں باہم دگر الفت پیدا ہو جائے گی (فالف بین قلوبکم) اور اسی سے تم بھائی بھائی بن جاؤ گے (فاصبحتم بنعمته اخوانا)۔ قرآن کی یہ مرکزیت عملاً اس طرح ہو گی کہ تمام دنیا کے مسلمان۔ جہاں کہیں بھی وہ ہیں۔ قرآنی ضابطہ آئین کو اپنی حکومت کے قانون کی اساس قرار دے لیں۔ قانون کی وحدت سے، جسے حکومت کی وحدت کہنا چاہیئے۔ قوم میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب ساری دنیا کے مسلمانوں کا قانون ایک ہو جائے گا تو ان کی قوم بھی ایک ہو جائے گی۔ اس طرح نہ سیاسی قومیتیں باقی رہیں گی بجز اس کے کہ ان سے مقصود صرف تعارف ہو اور نہ ہی مذہبی فرقے

اور یہ کچھ مشکل نہیں۔ آپ نے حکومتوں کے لیئے لامحالہ قانون مرتب کرنے ہیں۔ لیکن مسلمان کے لیئے خدا کے قانون سے بڑھ کر اور کونسا قانون واجب الاتباع ہوسکتا ہے؟ تو پھر کیوں نہ قرآن ہی کو قانون کی اساس بنایا جائے۔ اگر مسلمانوں کی ہر حکومت، اپنی اپنی جگہ پر آئینی تبدیلی کرلے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد، یہ تمام حکومتیں کس طرح غیر شعوری طور پر ایک ہی حکومت بن جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ طریق وحدت جسے خدا نے تجویز کیا اور اس کے رسولؐ نے اسے عملی طور پر کرکے دکھایا۔ اس کے سوا اخوت اسلامی اور وحدت ملی کا اور کوئی طریق نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ جب

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک!

لیکن ــــ

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا انہیں پاس نہیں

[ہمیں امید ہے کہ محترم پرویز صاحب کی تقریر پڑھ لینے کے بعد قارئین طلوع اسلام ہم سے متفق ہوں گے کہ ہمارے محکمہ ریڈیو کی یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ وہ ایسے ایسے اہم موضوعات کے لئے صرف پندرہ منٹ کا وقت دیتے ہیں۔ دہلی میں تو یہ بات سمجھ میں آسکتی تھی۔ اس لئے کہ ریڈیو کی پالیسی غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھی اور اگر ان کے پروگرام میں کبھی اس قسم کا کوئی عنوان جگہ پالیتا تھا تو محض اس لئے کہ انہیں نظر نہ لگے "لیکن معلوم یہاں ہماری" سب سے بڑی اسلامی سلطنت" کے راستہ میں کونسی چیز حائل ہے کہ وہ اسلام سے متعلق اس قسم کی بنیادی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش نہیں کرسکتی۔ ہمارے خیال میں یہ نہایت ضروری ہے کہ اس قسم کے موضوعات کے لئے وقت زیادہ ہو۔ ان تقریروں کو ریکارڈوں میں محفوظ کرکے بار بار دہرایا جائے، اور صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ عربی اور فارسی میں بھی انہیں نشر کیا جائے۔ ایک اسلامی سلطنت کے ریڈیو کا تو فریضہ ہی یہی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ تو وہ کریں جنہیں اس کا احساس ہو کہ ہم خوابوں کی دنیا سے اب عالمِ حقائق میں آچکے ہیں۔ اور یہ احساس پیدا نہیں ہوسکتا جب تک نگاہ میں ایک بنیادی تبدیلی نہ پیدا ہوجائے ــ]

طلوع اسلام

اسلام کا نظریۂ جہاد (۳)

(حکیم حیدر زمان صاحب صدیقی۔ صدیقی دواخانہ منٹگمری)

دعوتِ اسلامی میں جہاد کا موقف

دعوتِ اسلامی میں جہاد و قتال کے لئے ایک خاص موقف ہے جو کتاب اللہ اور علوم سنت کے گہرے مطالعہ کے بعد ہی متعین ہو سکتا ہے۔ مگر دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو حقیقت اشیاء کو سمجھے بغیر ہی بحث و مذاکرہ کیلئے تیار رہتے ہیں حالانکہ عقل و دانش کا اقتضا یہ ہے کہ کسی چیز پر رائے زنی کرنے سے پہلے اس کی حقیقت اور اس کے تمام اطراف و جوانب پر انتہائی متانت سے غور و فکر کر لیا جائے۔ اور اس کے مالۂ و ماعلیہ کے فہم و ادراک میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

کہا جاتا ہے کہ جب اسلام کا منشا یہ ہے کہ اس کے ماننے والوں کو تمام روئے زمین میں سیاسی اقتدار حاصل ہو اور اس مقصد کے لئے وہ اپنے پیروؤں کو جہاد و قتال کا حکم دیتا ہے تو اس کا مطلب بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ہر انسان محض اختلافِ عقیدہ کی بنا پر گردن زدنی ہے اور وہ کسی ایسے شخص کو زندہ رہنے کا حق ہی نہیں دیتا جو اس کے اصول و نظریات پر ایمان نہ رکھتا ہو یا اسلام کی بارگاہ سے صرف اسی شخص کو زندہ رہنے کی رعایت ملتی ہے جو اسلام کے اقتدار کے تحت مقہوریت و ذلت کی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہو جائے۔ چنانچہ یہ لوگ اس دعوے کی تائید میں قرآن کریم کی چند ایسی آیات پیش کرتے ہیں جن میں علی الاطلاق اہل کفر کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان آیات میں کسی زمان و مکان اور قوم و نسل کی تخصیص نہیں ہے اور اسی سلسلہ میں وہ آیات بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں جنگ و قتال کی غایت و انتہا یہ قرار دی گئی ہے کہ اہل کفر اقتدارِ اسلامی کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔

درحقیقت مذکرہ خیال کا اصل منشا یہی آیات جہاد ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خود مسلمانوں کا ایک گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اسلام کی سیاست خارجہ یعنی مسلمانوں کا غیر مسلموں سے تعلق (Foreign Policy) دو چیزوں میں سے کسی ایک پر مبنی ہے۔ قبولِ دعوت یا اطاعت۔ سب سے پہلے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی جاتی ہے اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں تو وہ مسلمانوں کے بھائی تصور ہوتے ہیں اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر ان کو دولت اسلامیہ کی اطاعت پر مجبور کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا سوال کی دو شقیں ہیں۔ شق اول یہ ہے کہ اسلام محض اختلافِ عقیدہ و مسلک کی بنا پر اپنے پیروؤں کو لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے اور دوسری شق یہ ہے کہ اسلام صرف اس صورت میں غیر مسلموں کو

زندہ رہنے کا حق دیتا ہے کہ وہ اپنی جان و مال اور عزت و ناموس مسلمانوں کے حوالے کر دیں اور خود ذلت و رسوائی اور محکومی و غلامی کی زندگی بسر کریں۔ چونکہ یہ دونوں شقیں الگ الگ بحث و نظر کی محتاج ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہر ایک پر مستقلاً اور جداگانہ تبصرہ کیا جائے۔

اصل مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ دعوتِ اسلامی میں جہاد و قتال کا اصلی موقف کیا ہے؟ یعنی اسلام جس طرز کا ہمہ گیر سیاسی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے حصول کے لئے اس نے کیا طریق کار متعین کیا ہے؟ کیا جنگ و قتال ہی کے ذریعہ وہ اس مقصد کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ یا اس کے حصول کی اصلی راہِ عمل کچھ اور ہے اور جہاد و قتال اس راہ کے عوائق و موانع کو ہٹانے کے لئے ایک ناگزیر عمل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس طرح کا ہمہ گیر سیاسی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے لئے اس نے بالکل فطری اسلوب کار متعین کیا ہے۔ یعنی وہ اس کارِ عظیم کو قتل و غارت، تشدد و سفاکی اور دہشت انگیزی سے انجام دینا نہیں چاہتا بلکہ دعوت و ارشاد اور تطہیر نفوس کے ذریعہ وہ اذہان و قلوب میں ایسے طرز کی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جس سے دنیا کے انسان خود بخود ہی اس نئے انقلاب کی جد و جہد میں حصہ دار بن جائیں۔ اسلام اس غرض کے لئے کسی پر دباؤ ڈالنا نہیں چاہتا کہ وہ اپنے اصول و نظریات اور فلسفۂ زندگی اور اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے۔ کیونکہ اسلام قانون فطرت ہے اور وہ ہر معاملہ میں فطرت کے اقتضا کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک انسان کو اس بات کا کامل یقین نہ ہو کہ میں جس عقیدہ و مسلک کو قبول کر رہا ہوں میری زندگی کی فلاح و نجات اسی سے وابستہ ہے اس کا یہ ایمان اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزین نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خارجی دباؤ کے زیر اثر اس عقیدہ کو قبول کر لے۔ مگر جونہی یہ خارجی دباؤ کم یا زائل ہو جائے گا وہ اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ آئے گا۔ لیکن اگر دلائل و براہین سے اس کے قلب کو مطمئن کر دیا جائے اور وہ خود محسوس کرنے لگے کہ جس عقیدہ کو میں نے قبول کیا ہے وہ فی الواقع نجاتِ انسانی کے لئے ناگزیر ہے۔ یعنی اس کو اس عقیدہ کے متعلق کماحقہٗ شرح صدر اور اطمینان قلب حاصل ہو جائے، تو وہ نہ صرف اپنے لئے اس جدید مسلک کو مفید خیال کرے گا۔ بلکہ وہ اپنا فرض اولین تصور کرے گا کہ دوسروں کو بھی اس جدید نظریۂ زندگی سے روشناس کرائے۔ چنانچہ اسی حکمت کے پیش نظر اسلام نے اس معاملہ میں جبر و اکراہ سے منع کر دیا ہے اور کسی عقیدہ کے رد و قبول کے سلسلہ میں انسان کو پورا اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ اپنی صوابدید سے اپنے لئے جو مسلک چاہے اختیار کرے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (بقرہ)

دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہے کہ ہدایت کی راہ گمراہی کی راہ سے بالکل واضح اور الگ ہو چکی ہے۔

مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (آیہ)

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کی راہ اختیار کرے۔

مگر جہاں تک حقیقت الامر کے اظہار و بیان کا تعلق ہے خالق کائنات نے ارسال رسل اور انزال کتب کے ذریعہ اس کام کی تکمیل کردی ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے اس نے ہر زمانہ میں نبی بھیجے کہ وہ انسانوں کو صحیح راہ نجات سے آشنا کردیں تاکہ وہ بعد میں یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں اس کا علم ہی نہ تھا۔

لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل (آیۃ)

تاکہ انبیاء کے بھیجے جانے کے بعد لوگوں کی طرف سے اللہ پر کوئی الزام نہ رہے۔

خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں کو پکار پکار کر اس منزل کا نشان بتا دیا اور انہوں نے اس عظیم انسانی فریضۂ زندگی کو کمال جرأت و دیانت سے انجام دیا۔ یہاں تک کہ دلائل و بینات اور براہین قاطعہ کے ذریعہ ان کے فرار کی تمام راہیں مسدود کردیں اور ہر قدم پر ان کو لاجواب ہونا پڑا۔ اب اس اتمام حجت کے بعد اگر کوئی شخص حق و صداقت کی متاع گراں سے محروم رہتا ہے تو وہ خود ہی اس کا ذمہ دار ہے۔ اور وہ دیدہ و دانستہ غلط راستہ پر گامزن ہے۔

قد جاءکم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیھا وما انا علیکم بحفیظ (الانعام)

بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلائل آچکے ہیں۔ پس جو شخص ان دلائل سے بصیرت و ہدایت حاصل کرے گا۔ اس کا فائدہ اس کی ذات کے لئے ہوگا۔ اور جو شخص ان دلائل سے آنکھیں بند کرے گا اس کا وبال اسی پر ہوگا۔

لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحیی من حی عن بینۃ (الانفال)

تاکہ جو شخص ہلاک ہونا چاہتا ہے۔ وہ علی وجہ البصیرت ہلاکت کی راہ پر چلے اور جو شخص زندہ رہنا چاہتا ہے (اسلام کی راہ پر چلنا چاہتا ہے) وہ بھی قیام بینہ کے بعد زندگی کی راہ اختیار کرے۔

اسی طرح اسلام اپنے پیروؤں کو اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ محض ملک گیری، حرص استعمار، توسیع مملکت اور دوسرے ممالک کے ذخائر دولت پر قبضہ کرنے کے لئے انسانی بستیوں کو تہ و بالا کریں یا انسانوں کو محض اس لئے اسلامی اقتدار اعلیٰ کے قبول کرنے پر مجبور کریں کہ ان کا عقیدہ و مسلک دوسرا ہے۔ غرض اسلام کا اصلی طریق دعوت یہ ہے کہ پرامن اور بے ضرر طریق سے دین حق کی اشاعت کی جائے اور خدا کے ازلی پیغام کو دنیا کے ہر حصہ میں پہنچایا جائے۔ یہاں تک کہ معمورۂ ارضی کا کوئی بعید سے بعید گوشہ بھی ایسا نہ رہے جہاں یہ پیغام پہنچایا نہ گیا ہو۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اسی طریق دعوت کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ (آیۃ)

ان نصوص قرآنی سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں کو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ خدا کی

مخلوق کو محض اس لئے نشانہ ستم بنائیں کہ وہ الگ عقیدہ و مسلک رکھتے ہیں البتہ اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ حق ضرور دیتا ہے۔ کہ وہ جہاں کہیں انسانوں کی آبادی ہے وہاں تبلیغ کر حق کی آواز بلند کریں اور حفاظت خود اختیاری کی خاطر جہاں تک ممکن ہو اپنے لئے طاقت فراہم کریں۔ تاکہ اگر کوئی جماعت ان سے محض اس بنا پر مزاحم ہو کہ وہ خدا کا پیغام کیوں سناتے ہیں اور وہ بے وجہ مسلمانوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے تو مسلمان اس قسم کے شریر عناصر کی شر انگیزیوں کو قوت بازو سے ختم کر سکیں۔ یہاں تک کہ تمام روئے زمین میں کوئی ایسی طاقت باقی نہ رہے جو اس اہم فریضۂ زندگی کی انجام دہی میں ان کی مزاحمت کر سکتی ہو۔ چنانچہ جہاد بالسیف کا اصلی مقام و موقف یہی ہے اور ایسی حالت میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی تمام طاقتوں کو ان لوگوں کے خلاف متحرک کر دیں۔ جو مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض سے باز رکھنا چاہتے ہیں اور علی الاعلان یا خفیہ طور پر اسلام کی دعوت حق کی مخالفت کرتے ہیں۔

ان الذین کفروا ینفقون اموالہم لیصدوا عن سبیل اللہ فسینفقونہا ثم تکون علیہم حسرۃ ثم یغلبون (الانفال)

بے شک جو لوگ کافر ہیں وہ اپنے اموال اس غرض کے لئے خرچ کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں، پس وہ اپنے اموال خرچ کرتے رہیں گے۔ پھر یہ اموال انہیں کے لئے حسرت و افسوس کا باعث بنیں گے۔ پھر وہ مغلوب ہوں گے۔

کتاب اللہ اور اعمال رسالت سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام مذہب کے نام پر بے گناہ انسانوں کا خون بہانے اور انسانی آبادیوں کو تہ و بالا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ زمانہ رسالت کے کئی واقعات اس سلسلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت کا طریق دعوت و تبلیغ کیا تھا اور کیا وہ اہل کفر کو محض کفر کی وجہ سے واجب القتل تصور فرماتے تھے اور ان سے جہاد بالسیف کو ضروری قرار دیتے تھے یا جہاد بالسیف کیلئے کچھ دوسرے اسباب تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ رسالت کے تمام واقعات صلح و جنگ کا جو اسلام کے بین الملی قانون (International Laws) اور قانون جنگ کے لئے ماخذ ہیں۔ اگر بنظر غور جائزہ لیا جائے تو ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ رسالت بلکہ خلافت علی منہاج النبوۃ کے دور سعادت میں بھی کسی قوم پر محض اس لئے حملہ نہیں کیا گیا کہ وہ کسی دوسرے مذہب کی پیرو ہے۔ اس دور میں جس قدر جنگیں ہوئی ہیں ان کا اصلی محرک اس وقت کی اقوام کا وہ جارحانہ طرز عمل تھا جو انہوں نے اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف اختیار کیا تھا۔ مگر جن اقوام یا قبائل نے ایسا نہیں کیا ان پر مسلمانوں نے ہرگز فوج کشی نہیں کی بلکہ ان کو چند شرائط کے ساتھ اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ کتب حدیث و سیر میں "سرایا" کے عنوان سے ان تبلیغی جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات کی جانب بھیجی تھیں۔ یہ جماعتیں اگرچہ باقاعدہ مسلح ہوتی تھیں۔ کیونکہ اپنی حفاظت اس کے سوا ممکن نہ تھی۔ مگر ان کو ہدایت کر دی جاتی تھی کہ وہ لوگوں سے نرمی سے پیش آئیں اور اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کے ذریعہ ان کو اپنے قریب لانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ طبری نے لکھا ہے۔

وقد کان رسول اللہ صلعم یبعث فیما حول مکۃ السرایا تدعوا الی اللہ

ولم یامرھم لقتال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے ارد گرد تبلیغی جماعتیں بھیجی تھیں اور اُن کو لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

بخاری میں ایک واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک تبلیغی جماعت بنی خذیمہ کی طرف بھیجی۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر اس قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی مگر ان لوگوں نے انکار کیا اس پر حضرت خالد نے کچھ لوگوں کو قتل کیا اور دوسروں کو اسیر بنا کر اپنے سپاہیوں کی تحویل میں دیدیا۔ اور پھر سب کو حکم دیا کہ تم اپنے اپنے اسیر کو قتل کر دو۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ بھی اس جماعت میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایسی حرکت ہرگز نہ کریں گے۔ جب یہ جماعت مدینہ واپس پہنچی اور یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے حضرت خالد کے اس فعل کو سخت ناپسند فرمایا۔ اس موقع پر یہ الفاظ آپ نے ارشاد فرمائے۔

اللھم انی ابرء الیک مما صنع خالد (بخاری کتاب المغازی)

اے خدا! میں خالد کے اس فعل سے بیزار ہوتا ہوں۔

قبیلہ اشجع کے کچھ لوگ مدینہ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ سے لڑنا نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ معاہدہ یا صلح ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست کو قبول فرما لیا۔ یہ لوگ اس وقت تک کافر تھے۔ مگر جب معاہدہ صلح ہو چکا تو بعد میں خود ہی انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

(جزو طبقات ابن سعد صفحہ ۴)

یہ صحیح ہے کہ بعض آیات قتال سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اہل کفر صرف عقیدۂ کفر کی بناء پر واجب القتل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خود مسلمانوں کا ایک گروہ یہی عقیدہ رکھتا ہے۔ ہم آگے چل کر آیات قتال کی وضاحت کریں گے مگر اس مقام پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اسلام اگرچہ دعوت اسلامی کے سلسلہ میں کسی طرح کے جبر و اکراہ کی اجازت نہیں دیتا اور نہایت پرامن طریق سے اس فریضہ کو انجام دینے کی تاکید کرتا ہے۔ مگر وہ اس بات سے بھی غافل نہیں ہے کہ قوت غالبہ اور اقتدار حکومت کے سوا یہ ممکن ہی نہیں کہ تمام روئے زمین میں اس کام کو جاری رکھا جائے جو اسلام کا اصل منشا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اسلام چاہتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک آزاد اور خود مختار مرکز ہو جہاں وہ اپنی منتشر طاقتوں کو اکٹھا کر سکیں اور اسلام کے منشا کے مطابق مسلمانوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت کا کام پوری آزادی کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔ اور ضرورت پڑنے پر اپنی تمام طاقتوں کو ان لوگوں کے خلاف متحرک بنا سکیں جو مسلمانوں کو ان کے فرائض منصبی سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوں۔ اور علانیہ یا خفیہ طور پر مرکز اسلامی کو کمزور کرنا چاہتے ہوں۔ اور چونکہ یہ مرکز صرف کلمۃ اللہ کی بلندی کے لئے معرض وجود میں آتا ہے۔ اس لئے جو شخص اس مرکز کو مٹانا اور اس کے خلاف سازش کرنا چاہتا ہے تو وہ اسلام کی نظر میں سخت ترین مجرم اور واجب القتل ہے۔

من جاءکم وامرکم جمیع یرید ان یفرق بینکم فاقتلوہ کائناً من کان

جو شخص اس غرض سے آتا ہے کہ تمہارے شیرازۂ ملت کو منتشر کر دے تو اس کو قتل کر دو خواہ وہ کوئی ہو۔

اور قرآن حکیم میں ہر ایسی کوشش کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا ہے جو دعوت اسلامی یا مرکز اسلامی کے خلاف عمل میں لائی جاتی ہو۔

انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیہم وارجلہم من خلاف او ینفوا من الارض ذالک لہم خزی فی الحیوۃ الدنیا ولہم فی الاخرۃ عذاب عظیم (آیہ)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھایا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیئے جائیں یا ان کو جلاوطن کر دیا جائے یہ ان کے لئے حیات دنیوی کی سزا ہے اور آخرت میں ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

اسلام کی سیاست خارجہ

یہاں تک صرف اتنا عرض کیا گیا ہے کہ جہاد بالسیف دعوت اسلامی کا ضروری جزو یا لازم غیر منفک نہیں ہے۔ لیکن عملاً اکثر و بیشتر حالات میں اس کے بغیر دعوات کا جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور ایسے حالات کے لئے جہاد بالسیف کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

اب ہم اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

گذشتہ مباحث سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ اسلام محض عقیدہ و مسلک کی بنا پر کسی کو واجب القتل نہیں قرار دیتا اور یہ کہ اسلام کا اصل منشا جنگ و قتال نہیں ہے بلکہ قیام امن ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا یقیناً صحیح ہوگا کہ اسلام کی سیاست خارجہ کی اساس قیام امن اور عالم انسانی کی حقیقی نجات کا مقدس جذبہ اخوت ہے اور تاوقتیکہ حکومت اسلامی کو جنگ کے لئے مجبور نہ کر دیا جائے اس وقت تک اسلام اس کو جنگ و قتال کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ نصوص قرآنی کے علاوہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بہت سے واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اقوام عرب سے وقتاً فوقتاً جو وعدے کئے ان سے مقصد یہی تھا کہ جنگ کے بغیر ہی ملک میں امن قائم رہ سکے اور خواہ مخواہ ملک کو شورش و بدامنی کے حوالے نہ کیا جائے۔

چنانچہ مدینہ میں تشریف آوری کے بعد قبائل یہود سے باقاعدہ معاہدہ ہوا۔ جس میں سب سے زیادہ اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ہم دونوں فریق مل کر اپنے ملک کی حفاظت کریں۔ اور بیرونی دشمن کے دفاع کے لئے متحد ہو جائیں۔ قبائل یہود نے ایک دو مرتبہ عہد شکنی بھی کی مگر ان کو معاف کر دیا گیا۔ مگر اس قدر فراخدلانہ ثبوت کے باوجود یہود مدینہ اپنی خفیہ سازشوں سے باز نہ آئے تو اس کے بعد ان کو عبرتناک سزا دی گئی۔ اور ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت اس بات کو برداشت نہیں کرتی کہ اس کی قلمرو میں حکومت کے خلاف اس قسم کی سازشیں کی جائیں۔ اور خفیہ طور پر دوسرے ممالک سے سازباز کی جائے۔ چنانچہ اس قسم کے مجرمین کے لئے ہر حکومت سخت گیرانہ قوانین وضع کرتی ہے۔ جن سے ایسے عناصر کا قلع قمع ہو سکے۔ چنانچہ مسلسل

بدعہدیوں کے بعد یہود کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔

الذین عاھدت منھم ثم ینقضون عھدھم فی کل مرۃ وھم لا یتقون فاما تثقفنھم فی الحرب فشرد بھم من خلفھم لعلھم یذکرون واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سواء ان اللہ لا یحب الخائنین (الانفال)

وہ جن سے آپ نے معاہدہ کیا۔ پھر وہ ہر دفعہ اپنے عہد کو توڑتے ہیں اور وہ (اس کے انجام سے) ڈرتے نہیں ہیں۔ پس اگر آپ ان کو لڑائی میں پالیں (تو ان کو ایسی عبرتناک سزا دیں) کہ ان کے ذریعہ دوسروں کو بھی منتشر کر دیں۔ اور اگر آپ کو کسی قوم سے بدعہدی کا خوف ہو تو عدل کے طریق پر عہد کو ان کی طرف پھینکدیں۔ بے شک اللہ تعالےٰ بدعہدی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

اسی طرح قریش سے ایک معاہدہ کیا گیا جس میں یہ طے کیا گیا کہ دس سال تک ایک فریق دوسرے کے خلاف جنگی کارروائی نہ کرے گا۔ ظاہر ہے اس زمانہ میں قریش ہی مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ جس وقت یہ معاہدہ ترتیب دیا گیا تھا اس سے کچھ ہی عرصہ قبل مسلمانوں سے ان کی شدید جنگیں ہو چکی تھیں اور فریقین کے دلوں میں آتش انتقام بھڑک رہی تھی مگر آنحضرت صلعم کا منشا یہ تھا کہ جنگ و قتال کے بغیر ہی اگر ان لوگوں کے دلوں میں تبدیلی پیدا ہو جائے تو جنگ کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بہت تھوڑے عرصہ میں عرب کے اطراف و جوانب میں اسلام پھیل گیا بلکہ خود قریش کے بہت سے معتقد اصحاب نے اسلام قبول کر لیا۔

فلما کانت الھدنۃ ووضعت الحرب اوزارھا وامن الناس کلھم بعضھم بعضا فالتقوا وتفاوضوا فی الحدیث والمنازعۃ فلم یکلم احد بالاسلام یعقل شیئا الا دخل فیہ (طبری صفحہ ۱۵۰۱)

جب صلح ہو گئی تو لڑائی نے اپنے ہتھیار رکھ دیئے اور لوگ ایک دوسرے سے محفوظ ہو گئے پس وہ باہم ملنے لگے اور باہم بحث و مذاکرہ کرنے لگے پس جس سمجھدار آدمی سے اسلام کی نسبت بات چھڑی وہ اسلام میں آ گیا۔

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کی قوت ٹوٹ گئی اور ان میں مسلمانوں کے مقابلہ کی ہمت ہی نہ رہی۔ چنانچہ ۸ھ میں جب آنحضرت صلعم نے قریش پر فوج کشی کی تو انہوں نے دفاع و مقابلہ کے بغیر ہی اطاعت قبول کر لی۔

اسلام اور احترام انسانیت

فتح مکہ کا واقعہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم بالشان واقعہ ہے۔ اور اسی واقعہ سے اسلامی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یعنی عرب کے تمام قبائل اور ریاستوں نے حکومت اسلامی کی اطاعت قبول کر لی اور حکومت اسلامی پہلے سے وسیع تر ہو گئی۔ مگر اس واقعہ میں اہل نظر کے نزدیک اس سے بھی زیادہ جس چیز کو اہمیت حاصل ہے، وہ احترام انسانیت کے اس مقدس جذبہ کا مظاہرہ ہے جو صرف ملت اسلامی کے حصہ میں آیا ہے اور دوسری تمام اقوام و ملل ہیں کلی طور پر نا پید ہے

قریش کی دیرینہ شدید عداوت اور مسلسل ایذا رسانی ہرگز اس کی مستحق نہ تھی۔ کہ انسے انسانی کے ساتھ معاف

کر دیا جاتا۔ اور دنیا کی کوئی قوم ایسے متعصب اور کینہ پرور دشمن کو زندہ رہنے کا حق نہیں دے سکتی۔ اور قریش کا کینہ اور تعصب اور جذبۂ انتقام تو اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ پوری انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مکہ معظمہ کی تیرہ سالہ زندگی میں ان لوگوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی صاحب رسالت علیہ السلام اور عام مسلمانوں کو امن وچین سے بیٹھنے نہ دیا۔ اور ہجرت مدینہ کے بعد انہوں نے بارہا مسلمانوں پر حملہ کیا اور اسلام کو مٹانے کی جو ممکن کوشش ہو سکتی تھی دریغ نہ کیا۔ غرض اسلام کے تیئیس سالہ دور میں ان لوگوں نے مسلمانوں پر جو وحشیانہ مظالم کئے تھے ان کی یاد ابتک مسلمانوں کے دلوں میں تازہ تھی۔ بلکہ کچھ مسلمان چاہتے تھے کہ اس ظالم اور بدکردار قوم کا ایک فرد بھی زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ چنانچہ جس وقت اسلامی فوج مکہ میں داخل ہو رہی تھی تو سعد ابن عبادہؓ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے۔

اليوم يوم الملحمه، اليوم تستحل الكعبة

آج کا دن سخت خونریزی کا دن ہے آج کعبہ کی حرمت اٹھا دی جائیگی

ان الفاظ سے ابو سفیان کو بہت دکھ ہوا اور رحمۃ للعالمین (صلعم) سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے حضرت سعدؓ کو ان الفاظ میں جواب دیا۔

كذب سعد ولكن هذا يوم بر ووفاء وهذا يوم يعظم منه الكعبة

سعد نے یہ جھوٹ کہا ہے بلکہ یہ بر و وفا کا دن ہے اور آج کعبہ کی عظمت کو دوبالا کیا جائے گا۔

چونکہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہوئے تھے اور قریش نے لاشوں کی بھی تذلیل کی تھی اور مسلمانوں کو ان کے اس ناروا سلوک پر اس قدر صدمہ ہوا تھا کہ کچھ مسلمانوں نے عزم کر لیا تھا کہ قریش پر غالب آنے کے بعد ہم ایک مسلمان کے بدلہ میں قریش کے دو آدمی قتل کریں گے۔ اس پر قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير للصابرين

(النحل)

اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو تم ان کو اتنا ہی نقصان پہنچاؤ جتنا انہوں نے تم کو نقصان پہنچایا ہے۔ اور اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہت بہتر ہے۔

جب عسکر اسلامی مکہ کے بالائی طرف شہر میں داخل ہو رہا تھا تو ایک شخص نے بآواز بلند یہ نعرہ لگایا۔

لا قريش بعد اليوم

آج کے بعد قریش زندہ نہ رہیں گے۔

مگر سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا۔

كفوا عن القوم الا اربعة (ترمذی)

سوائے چار اشخاص کے قریش کے تمام افراد سے ہاتھ روک لو۔

یہ وہ ظالم اور سفاک انسان تھے جن کی خون آشام تلواروں سے ابتک مسلمانوں کا خون ٹپک رہا تھا اور دنیا کے لوگوں کو یہ بات کا یقین تھا کہ آج قریش کا ایک بچہ بھی زندہ نہ بچ سکے گا۔ اور خود قریش کی حالت یہ تھی کہ ان کی بداعمالیاں ان کی آنکھوں کے آگے قیامت کا نقشہ پیش کر رہی تھیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جن لوگوں سے ہم مسلسل تیئیس سال کے عرصہ میں انتہائی

وحشیانہ سلوک کرتے رہے ہیں وہ آج یقیناً ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گے ۔ مگر دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی جبکہ رحمۃ للعالمین صلعم نے ان ظالم اور سفاک انسانوں کو ان الفاظ سے خطاب کیا۔

اذھبوا فانتم الطلقاء لا تثریب علیکم الیوم

جاؤ! تم آزاد ہو۔ آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ قریش سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کا دشمن کوئی نہ تھا مگر خود ہادی اسلام نے جو فراخدلانہ سلوک کیا وہ انسانی تاریخ کا ایک بے مثال اور عظیم الشان واقعہ ہے۔ ان حقائق کی موجودگی میں یہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ اسلام کسی غیر مسلم کو زندہ رہنے کا حق ہی نہیں دیتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جسنے اپنے پیروؤں کو احترام انسانیت کا سبق دیا ہے اور اسلام نے بغیر شدید ضرورت کے یسفك الدماء اور قتل و خونریزی ممنوع قرار دی ہے۔ مگر ایسی حالت میں جبکہ چند بے رحم اور سنگدل انسانوں کے ہاتھوں امن عامہ کو خطرہ لاحق ہو، خدا کی زمین میں معصیت و فساد کا دور دورہ ہو اور مخلوق خدا کی کوئی قیمتی متاع محفوظ نہ رہ سکتی ہو تو اس وقت بلاشبہ اسلام اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ شمشیر بکف آکر میدان کارزار میں کود پڑیں اور مفسدین کی شر انگیزیوں سے مخلوق خدا کو نجات دلائیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسی حالت میں بھی جہاد و قتال کی اجازت نہ دیجاتی تو دنیا کے شریف اور صالح انسانوں کو زمین کے کسی گمنام گوشہ میں بھی امن و چین نصیب نہ ہوتا اور دنیا کا نظام تہ و بالا ہو جاتا۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل علی العالمین۔ (آیہ)

اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین کا نظام تباہ ہو جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ لوگوں پر مہربان ہیں۔

غرض ایسے حالات میں اسلام نے بیشک تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ حکم فطرت اللہ کا عین اقتضاء ہے اور اسکی ضرورت سے کسی صاحب عقل کو مجال انکار نہیں ہے۔ لہذا اسلام جو فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے اس سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ عالم انسانی کو دائمی بدامنی اور شورش کے جہنم میں جھونک دے اور امن عالم کی عظیم ذمہ داری سے کنارہ کش ہو جائے؟ چنانچہ فریضہ جہاد کا اصل منشاء ہی یہ ہے کہ مفسدین فی الارض کے ناپاک عزائم کو ناکام بنا دیا جائے اور عالم انسانی میں ہمہ گیر امن قائم کیا جائے۔

کلما اوقدوا نارا للحرب اطفاھا اللہ ویسعون فی الارض فسادا واللہ لا یحب المفسدین (آیہ)

جب بھی یہ لوگ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اسکو بجھا دیتا ہے اور یہ لوگ زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

آیات جہاد کی تطبیق

غیر مسلموں سے مسلمانوں کا تعلق کیا ہے اور اسلام کی نظر میں غیر مسلم کس سلوک کے مستحق ہیں؟ یعنی اسلام کی سیاست خارجہ کی اساس کیا ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن کی آیا

میں بظاہر تعارض و اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس مسئلہ میں علمائے متقدمین کے دو گروہ ہیں، جیسے کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے۔

اس سلسلہ میں جو آیات قرآنی وارد ہوئی ہیں مفہوم و مصداق کے لحاظ سے ان کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) وہ آیات جن میں کفار سے حسن سلوک، بر و احسان، عفو و درگذر اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

(۲) وہ آیات جن میں اہل کفر سے جنگ و قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر یہ حکم مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔

(۳) وہ آیات جن میں علی سبیل الاطلاق اہل کفر سے جنگ کرنے اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے

(قسم اول کی آیات

لا یستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم

نیکی اور برائی برابر نہیں ہیں، آپ دشمن کی برائی کا اچھائی سے جواب دیں، پس وہ جو آپ کا دشمن ہے، مخلص دوست بن جائے گا۔

فاعفوا واصفحوا حتی یاتی اللہ بامرہ

تم معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حکم جہاد نازل فرمائے۔

وان صبرتم فھو خیر للصابرین

اگر تم دشمن کی ایذاؤں پر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہت بہتر ہے۔

ولمن صبر فان ذالک من عزم الامور

جو صبر کرے گا پس یہ عمل امور عزیمت سے ہے۔

اس مضمون کی بیسیوں آیات ہیں جو قرآن حکیم کے ہر حصہ میں ملتی ہیں۔

قسم دوم کی آیات

أذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر ۝

ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جاتی ہیں، جہاد کی اجازت دی جاتی ہے اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین ۝

تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد اعتدال سے تجاوز مت کرو بیشک اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیاً واجعل لنا من لدنک نصیرا

تمہیں کیا ہو اہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے لڑتے نہیں ہو جو یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی سے نکال دے جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی دوست اور مددگار بھیج دے ... ...

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا

اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ ان سے صلح کرلیں۔

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا

پس اگر وہ تم سے لڑائی نہ کریں اور آپ کو صلح کا پیغام بھیجیں تو اللہ تعالےٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف لڑنے کی کوئی وجہ جواز نہیں بنائی۔

اس مضمون کی آیات بھی قرآن حکیم میں بکثرت ملتی ہیں۔

قسم سوم

فاذا انسلخ الاشھر الحرم فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم وخذوھم واحصروھم واقعدوا لھم کل مرصد فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلھم ان اللہ غفور رحیم

جب اشہر حرم گذر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور ان کو پکڑ لو، ان کا محاصرہ کرو اور ان کے لئے ہر گھات میں بیٹھ جاؤ۔ پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ تو ان کا راستہ کھلا چھوڑ دو۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ ... ... !

تم سب مل کر منظم طریق سے مشرکین سے قتال کرو جیسے وہ سب مل کر تمہارے خلاف لڑتے ہیں۔

وقاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الاٰخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون

تم اہل کتاب کے ان لوگوں سے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو چیزیں خدا اور رسول نے حرام کر دی ہیں ان کو حرام نہیں سمجھتے۔ اور دین حق کو قبول نہیں کرتے۔ اس وقت تک جنگ کرو کہ وہ عاجز آکر جزیہ دینا قبول کرلیں۔

قرآن کریم میں اس مفہوم کی بہت سی آیات ملتی ہیں جن میں غیر مشروط طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ اہل کفر کو قتل کر دیا جائے، ان کو اطاعت پر مجبور کیا جائے۔ چنانچہ ان آیات کے اطلاق کے پیش نظر علماء سلف کا ایک گروہ اس امر کا قائل ہے کہ جہاد بالسیف بھی دعوتِ اسلامی کا ایک حصہ ہے۔ یعنی جب کفار کے سامنے اسلام پیش کیا جائے اور دلائل و براہین سے اسلام کی صداقت ثابت کر دی جائے اور پھر بھی وہ لوگ دعوتِ اسلامی کو قبول نہ کریں تو دعوت کی دوسری صورت یہ ہے کہ جنگ و قتال سے ان کو راہِ راست پر لایا جائے۔ یہ گروہ جہاد کی آیات مطلقہ سے پہلی دونوں قسم کی آیات کو منسوخ قرار دیتا ہے۔ مگر قطع نظر اس کے کہ اس صورت میں قرآن کی سینکڑوں آیات کو منسوخ تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور عقلِ سلیم اس سے انکار کرتی ہے[1]۔ یہ مسلک آیاتِ قرآنی کے مواقع صدق، اور سیاق و سباق کے عدم فہم اور فراستِ قرآنی کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام آیات جن کو تین انواع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اپنے اپنے محل میں مسلّمہ اور دائرۂ نفوذ میں محکم اور واجب العمل ہیں۔ چنانچہ قسم اول کی آیات جن میں حسن سلوک اور مروت و احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ معاشرتی امور سے متعلق ہیں۔ اور جن میں اہل کفر کے مظالم پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے وہ ایسے حالات سے مخصوص ہیں جبکہ مسلمان صاحبِ شوکت نہ ہوں اور اہل کفر کے مقابلہ و دفاع کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔ نیز ان احکام کی حیثیت انفرادی ہے یعنی ان کا تعلق افرادِ ملت سے ہے اور جہاد فریضۂ ملی ہے جس کا تعلق پوری ملت اور دولتِ اسلامیہ سے ہے۔ یعنی جہاد اس وقت تک جائز ہی نہیں جب تک کہ مرکزِ ملت (خلیفہ) کی طرف سے باقاعدہ حکم جہاد نہ دیا گیا ہو اور اس میں مصلحتِ عامہ یعنی پوری ملت کے مفاد کا لحاظ نہ کیا گیا ہو۔

جہاد کی آیاتِ مطلقہ میں اگرچہ بظاہر غیر مشروط طور پر اہل کفر سے قتال کا حکم دیا گیا ہے مگر یہ آیات سیاق و سباق اور مصداق کے اعتبار سے عام نہیں ہیں بلکہ محارب قوم سے مخصوص ہیں اور ظاہر ہے کہ جو قوم مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہو، یا وہ دعوتِ اسلامی کی راہ میں مزاحمت کرتی ہو یا اس کی مملکت میں مسلمانوں کے حقوق محفوظ نہ ہوں اور وہ بے وجہ مسلمانوں کو تنگ کر رہی ہو۔ تو ان تمام صورتوں میں حکومتِ اسلامی کا فرض ہے کہ وہ اس قوم کے خلاف فوجی اقدام کرے۔

اب وہ آیات سامنے آتی ہیں جن میں مشروط طور پر جنگ و قتال کا حکم دیا گیا ہے اور جن کو قسم دوم میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان آیات کا منشا ظاہر ہے کہ جب اہل کفر کی طرف سے کوئی ایسا قدم اٹھے جو فساد فی الارض پر منتج ہو سکتا ہو یعنی وہ دعوتِ اسلامی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریں، یا مخلوقِ خدا کو بے وجہ نشانۂ ظلم بنائیں۔ حقوقِ انسانی کو پامال کریں، اور اہل اسلام کو صرف اس وجہ سے ایذا دیں کہ وہ مسلمان ہیں تو ان حالات میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس مفسد قوم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اس کو اس کے اعمال کی عبرتناک سزا دیں۔

اس طریقِ توفیق سے وہ تمام آیاتِ قرآنی جو اسلام کی سیاستِ خارجہ سے متعلق ہیں اپنی اپنی جگہ محکم ہوں گی اور اس کی ضرورت نہ رہے گی کہ بے شمار آیات کو منسوخ تسلیم کرنے کی قباحت مول لی جائے۔

---

[1] اس لئے کہ ناسخ و منسوخ کا عقیدہ، قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ (طلوعِ اسلام)

ادب کی اسلامی قدریں

(پروفیسر محمد موسیٰ خان کلیم افغانی)

ایک ہمہ گیر نظام کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ زندگی کے ہر ایک شعبے کا جائزہ لے، اس کی اہمیت کا اندازہ لگائے۔ اور سرحدِ حیات میں اس کا مقام متعین کرے۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک ہمہ گیر نظامِ حیات ہے۔ اس لئے ناممکن ہے۔ کہ ادب ایسے اہم تخلیقی عمل کے متعلق وہ کچھ بھی نہ کہے۔ دنیا کے ہر ایک نظام نے ادب کے متعلق اپنا زاویۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جمہوریت نے، فاشیت نے اشتراکیت نے اپنا اپنا مخصوص نظریۂ ادب پیش کیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اس بارے میں خاموش رہا ہو۔ ہمارا خیال ہے۔ کہ اسلام اس بارے میں پوری قوت کے ساتھ لب کشا ہوا ہے۔ لیکن اسکی لب کشائی کے نتائج منظر عام پر کم آئے ہیں۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ اسلام کے مخصوص انداز نظر کی روشنی سے مسلمان قوموں کے ایوان ادب کم ہی روشن ہوئے ہیں۔ چنانچہ محرومی کے اسباب تلاش کرنے کی تو اس مختصر سی صحبت میں گنجائش نہیں۔ البتہ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم ادب کی اُن قدروں کا جائزہ لیں۔ جو اسلامی اندازِ نظر کے زیر سایہ وجود میں آئی ہیں۔

قرآن حکیم نے اپنے کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے عربی دنیا کو چیلنج کیا ہے۔ کہ وہ اس کے ادبی معیار کی ایک سورۃ بھی نہیں تیار کر سکتی۔ اور کون نہیں جانتا۔ کہ یہ چیلنج قبول کرنے کی کسی کو بھی ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن جب قرآن ادب کی بلند ترین صنف یعنی شاعری میں طبع آزمائی کرنے والوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے کہ اَلشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (شعراء اور ان کے پیرو گمراہ ہیں) اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ (نہیں دیکھتا کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں) يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ۔ (جو کہتے ہیں وہ نہیں کرتے) یہ سُنکر بڑی حیرت ہوتی ہے، اور سا خیال آتا ہے۔ کہ افلاطونی جمہوریت کی طرح قرآنی جمہوریت سے بھی شعر و سخن کو دیس نکالا مل گیا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن شاعروں اور اُن کے پیرؤوں کو محض اس لئے گمراہ نہیں سمجھ رہا۔ کہ وہ صنفِ شاعری کی تخلیق اور ترویج کے حامی ہیں۔ وہ شعر کے وجود کو مٹانا نہیں چاہتا۔ وہ تو گمراہ شاعروں کی گمراہی کے وجوہات پیش کر رہا ہے۔ قرآن نے ایسے گمراہ شاعروں کی تین خصوصیات بتائی ہیں۔

(۱) الغاوٗن۔ یعنی ایسے بے راہ کہ اپنی جہالت کے باعث اُس بے راہ روی پر مُصر ہیں۔

(۲) فی کل وادٍ یہیمون ۔ ان کا جنون انہیں کسی ایک مقام پر ٹکنے نہیں دیتا۔ ان کی متخیلہ حد سے زیادہ بے لگام ہے۔ اور وہ یا تو سطحی پرواز میں مصروف رہتی ہے۔ یا بال کی کھال اتارنا شروع کر دیتی ہے۔ ذہنی توازن کی نعمت سے انہیں محروم رکھتی ہے۔ شیکسپیئر نے بھی اس چیز کی تشریح کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

The poets eye in a fine frenzy rolling

گویا اس چیز کو اُس نے frenzy جنون کا نام دیا ہے۔ گو اس کے ساتھ fine کی صفت لگا کر اسے بہت اونچا مقام دے دیا ہے۔

(۳) یقولون ما لا یفعلون اُن کے قول اور فعل میں تضاد ہے۔ ظاہر ہے کہ قول اور فعل میں تضاد بھی واقع ہوتا ہے، جب کہ قول دل کی گہرائیوں سے نکلا ہو۔ اور اخلاص کے چشمے سے سیراب نہ ہوا ہو۔ اخلاص فن کی جان ہے۔ اور اس کے بغیر فن میں قوت اور تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

تو گویا واضح ہو گیا کہ قرآن کیوں شعرا اور اُن کے پیروؤں کو گمراہ کہتا ہے۔ قرآن کے نزدیک ہر وہ شاعر گمراہ ہے، جو جہالت کے باعث اپنی بے راہ روی پر قائم رہے۔ جو اپنی قوت متخیلہ کو بے لگام چھوڑ دے۔ اور اس طرح سے ذہنی توازن کی نعمت سے محروم ہو جائے۔ اور جو فن کے میدان میں اترے مگر اخلاص کے سہارے سے محروم ہو کر۔ اب خود ہی اندازہ لگائیے۔ کہ ایسا شاعر یا فنکار زندگی کی ترجمانی کرنے اور اسے وسعت بخشنے یا اسے گہرائی عطا کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو گا۔ کیا یہ جہالت کا حامی، توازن کی نعمت سے محروم، اخلاص کی دولت سے بے بہرہ انسان گمراہ نہیں تو اور کیا ہے؟ دراصل کلام مجید کی ان آیات نے ہمارے لئے حقیقی شاعر کا معیار قائم کر دیا ہے۔ اور ہمارے ہاتھ میں وہ کسوٹی دے دی ہے۔ کہ جس سے ہم اس جنس کا کھرا کھوٹا پرکھ سکتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ عرب شاعروں نے اس قرآنی ادبی کسوٹی پر کہاں تک غور کیا ہے۔ کیا انہوں نے اسی بنیاد پر اپنی ادبی تحقیق اور تنقید کی عمارت تعمیر کی تھی یا نہ؟ میں یہ کہوں گا کہ اس سوال کا جواب ایک طویل مطالعہ کا محتاج ہے۔ ہمیں پورے عربی ادب کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ اتنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اموی اور عباسی دور کی شعری ہستی کے بنیادی رخ سامنے آ جانے چاہئیں۔ چنانچہ اموی دور کے متعلق تو مورخینِ ادب کا اس امر پر اتفاق ہے۔ کہ ان کے ہاں شعر و ادب کے غیر اسلامی معیار ہی قائم رہے۔ وہ سبعہ معلقہ اور ان کے امام امرا القیس کے پرستار رہے۔ ان کے ہاں اپنی پرانی ادبی قدروں کا چرچا رہا۔ اور یہ غالباً اس لئے کہ عوام میں کوئی بڑی انقلابی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ذہنیت کا معیار بہت اونچا نہیں ہوا تھا صحرائی تہذیب کا دامن ابھی عجمی اثرات سے پاک تھا۔ عباسی دور کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ عجمی اثرات نے کلچر کی حدود

میں وسعت پیدا کر دی تھی۔ ماحول کا رنگ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ نئے مسائل پیدا ہو گئے تھے اور مناسب حل کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لازم تھا کہ زندگی کی یہ بدلی ہوئی روش ادبی تخلیقات پر بھی اپنا اثر کرتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ابُونواس۔ ابوالعتاہیہ متنبی اور ابوالعلیٰ معری زندگی کی بدلی ہوئی روش سے متاثر ہوئے۔ ابُونواس درباری عیش پرستی کے ماحول کا ترجمان ہے۔ ابوالعتاہیہ سوسائٹی کے درمیانی طبقے کی اخلاقی اور مذہبی زندگی کا نقاش ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان دونوں دوروں میں اسلامی اندازِ نظر کا ادبی تخلیقات اور ادبی ماحول پر بہت ہی کم اثر ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں۔ کہ عربی شاعروں اور ادیبوں نے اسلامی اداروں کی تبلیغ سے پہلو تہی کی ہے۔ اور نہ یہ کہ انہوں نے مذہبی تجربوں کو اپنی شاعری میں پیش نہیں کیا۔ اس چیز کو میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ صرف اتنا سمجھتا ہوں کہ تنوع کے فقدان کی یہ ایک وجہ ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے کائنات کے مظاہر یا انسانی زندگی کے عوامل کو اسلامی انداز سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مسلمان قوموں کی ذہنی ساخت پر اسلام کی مہر ثبت نہیں ہو سکی اور اس لئے اعمال کی روش خالص اسلامی نہیں رہی۔ یہاں مجھے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ کلچری وسعت کا میں پورا پورا حامی ہوں۔ مگر ایسی وسعت کا میں حامی نہیں۔ جو کلچر کو بنیادی طور پر اسلامی اندازِ نظر کی حدود سے باہر نکال لے جائے۔ میرے نزدیک معتزلہ عقل پرستی اور متصوفانہ بے چارگی دونوں اسلامی حدود سے باہر کی چیزیں ہیں۔ اور جو ادب ان کی تعمیر یا ترویج میں ممد ہوتا ہے۔ اسے میں اسلامی قدروں کا حامل نہیں سمجھتا۔

ایرانی شعر و ادب بڑی حد تک عربی شعر و ادب کا ایک حد تک عکس ہے۔ اس کی قدریں بھی زیادہ تر وہی ہیں۔ جو اسلامی اندازِ نظر سے محروم عربی ادب کی قدریں تھیں۔ رزم نگار فردوسی ہو یا قصیدہ گو انوری و خاقانی سب کے ہاں غیر اسلامی قدریں پائی جاتی ہیں۔ کیا ہوا جو رومی یا سعدی جیسا ایک آدھ اہلِ نظر کسی پورے دورِ شاعری میں کہیں نظر آ گیا۔ اور اسے بھی لوگوں نے اخلاقیات کا معلم سمجھ کر دور ہی سے سلام کیا۔ نہ اس کے اندازِ نظر کی پڑتال کی۔ نہ اس کی قدروں کا جائزہ لیا جنہیں وہ برتتا رہا۔ اور اس کے پیدا کئے ہوئے ادبی ماحول میں داخل ہو کر اس کی ادبی شخصیت سے استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ محاورے کا بادشاہ مان لیا۔ غزل کا امام مگر یہ نہ دیکھا۔ کہ اس کی ادبی عمارت کی بنیادیں آیا یہی محاورے کا انتخاب ہیں۔ اور تغزل کا وہ بلند مقام یا وہ خاص اندازِ نظر ہے۔ جس نے نبضِ ہستی ٹٹولنے کی اسے ہمت بخشی ہے۔ اور دلِ گیتی کی دھڑکنیں سننے کی قوت عطا کی ہے۔ ایرانی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ صوفیانہ شاعری پر مشتمل ہے اور غالباً دنیا کی کسی اور زبان میں صوفی منش شاعروں کا ایسا ذخیرہ نہیں جو فارسی زبان میں ہے۔ مگر ہم اسے زیادہ اہمیت اس لئے نہیں دیتے کہ وہ خالص اسلامی اندازِ نظر کی حامل نہیں ہے۔ اس کا اپنا مسلک ہے اس کی اپنی قدریں ہیں۔ اسلامی اندازِ نظر سے اس نے کوئی چیز اخذ کی ہے۔ تو وہ ہے انسان دوستی کا بلند معیار

اس کے نغمۂ ارژ رومی یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ ع

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر　　کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت　　شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

اُردو شاعری کا پودا ایک ایسے ماحول میں پھُولا پھلا ہے کسی لحاظ سے بھی خالص اسلامی ماحول نہیں کہا جاسکتا۔ اور پھر اس کی آبیاری بھی ہوئی تو ایک طرف ایرانی شاعری کی جوئے سست گام سے اور دوسری طرف ہندی شاعری کے دریائے نرم رو سے اور جو مقامی عناصر اس کی ترکیب میں شامل ہوئے وہ زوال آمادہ زندگی کی پیداوار تھے۔ اس لئے اُردو شاعری سے یہ توقع رکھنا کہ اس کا اندازِ نظر اسلامی ہوگا غلط ہے۔ نہ میر کی الم پرستی میں اسلامی قدروں کا شائبہ ہے اور نہ سودا کی ہجو و طنز میں۔ خواجہ میر درد اور مرزا مظہر جانجاناں صوفیانہ قدروں کے حامل ہیں۔ ان کے اندازِ نظر کو خاص اسلامی اندازِ نظر نہیں کہا جاسکتا۔ نظیر اکبرآبادی عوامی زندگی کا ترجمان ہے۔ اور اگرچہ اس کے ہاں کبھی کبھی انسان دوستی کے وہ بلند نغمے سنائی دیتے ہیں۔ جو اسلامی اندازِ نظر کی آغوش میں فراوانی سے ملتے ہیں۔ لیکن ان کا زاویۂ نگاہ اسلام سے زیادہ اس عملی مذہب سے قریب تر ہے۔ جو ایک ذہن رسا اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے تیار کر لیا کرتا ہے۔ غالب کے فن و فکر کی تہ میں اسلامی اندازِ نظر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ لیکن غالب کی خود پرستی اسے پوری طرح ابھرنے نہیں دیتی۔ اسکی شخصیت میں مغل بیگیزادم کے اثرات اتنے قوی ہیں کہ وہ اسلامی اندازِ نظر کے ڈسپلن سے اس وقت تک مانوس نہیں ہوتی۔ جب تک کہ زمانے کی ٹھوکریں اسے مجبور نہیں کر دیں۔ اکبر الہ آبادی ہندوستانی مسلمان کی اس مخصوص تہذیب کا شیدا ہے۔ جو اسے دم توڑتی نظر آرہی ہے۔ اور جس کے بچاؤ کی خاطر وہ اپنے شاعرانہ ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان میں اترا ہے۔ اور کون نہیں جانتا۔ کہ نہ اکبر کا اپنا اندازِ نظر خالص اسلامی اندازِ نظر ہے۔ اور نہ ہندی مسلمان کی تہذیب خالص اسلامی بنیادوں پر قائم ہے۔ حالی پہلا شخص ہے جس نے ہندی مسلمان کو اپنے درخشاں ماضی کی طرف لوٹ کر دیکھنے کی دعوت دی ہے۔ وہ پہلا شاعر ہے۔ جو ارادۃً اسلامی اندازِ نظر کے مطالعہ اور ترویج کی طرف راغب ہوا ہے۔ مگر وہ اس کام میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس لئے کہ اوّل تو اس کی اپنی شخصیت بڑی نہیں اور نہ ہی اس کے مطالعہ میں وہ وسعت اور گہرائی ہے۔ جو اس کی شخصیت کو اتنا قوی بنا سکے۔ کہ وہ ماحول پر چھا سکے دوم یہ کہ سرسید کی ہمہ گیر شخصیت کا اس پر سایہ ہے۔ اور وہ سرسید کی ترقی پسند نظر سے مرعوب ہو گیا ہے۔ ایسی ترقی پسند نظر جو اسلامی زاویۂ نگاہ پر حاوی ہونے سے پہلے اس کی ترجمانی شروع کر دیتی ہے اور اس ترجمانی میں یہ نہیں دیکھتی۔ کہ کہیں اصل کا حلیہ تو نہیں بگڑا جا رہا۔ ایسے عالم میں اقبال آتا ہے اور اپنے نظر و فکر کی وسعت اور قلندرانہ جرأت سے موجود کو "برہم زن" کا پیام دیتا ہے۔ اور اسلامی اندازِ نظر کو اس کی جگہ متمکن کرنے کی

کوشش کرتا ہے۔ اور وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ یہ آنے والی نسلیں ہی بتائیں گی لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ عام طور سے ہمارے ادب کا رُخ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ اس نے وہ صورت اختیار کر لی ہے جو اُسے اسلامی اندازِ نظر سے دور ترلئے جا رہی ہے۔ اور وہ وقت قریب ہے جبکہ وہ قوت حاصل کر کے اسلامی اندازِ نظر پر ایک بھرپور وار کرے۔ اور اپنی دانست میں اسے ہمیشہ کے لئے اس حلقہ سے نکال دے۔ اس نئے ادب کے حامیوں نے مارکسی نظریۂ ادب سے استفادہ کرنے کے بعد بہانگِ دہل اعلان کرنا شروع کر دیا ہے کہ ادب کی قدریں ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ جو لوگ مستقل قدروں کے حامی ہیں۔ وہ رجعت پسندی کا شکار ہیں۔ وہ آگے بڑھنا نہیں جانتے۔ وہ انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لہٰذا ضروری نظر آتا ہے۔ کہ ادب کی اُن قدروں کا جائزہ لیا جائے جو پوری نبی نوعِ انسان کے نزدیک مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جنہیں غالباً ہمارے ترقی پسند بھی مستقل ماننے پر مجبور ہوں گے

میرے نزدیک ادب کی وہ مستقل قدریں چار ہیں:۔

(۱) انسان دوستی (۲) مسرت یا بصیرت (۳) فطرت کی ترجمانی (۴) اظہار۔

دنیا کا کوئی ادب ہو۔ ادب کی ان چار قدروں کی مستقل حیثیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وہ ترکیبی عناصر ہیں۔ جن سے ایک ادب بنتا ہے اور جن کے بغیر ادب کو معیاری حیثیت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ مجھے اب آپ کی اجازت سے میں ادب کی پہلی بنیادی قدر کا اس صورت سے جائزہ لیتا ہوں کہ اس سے انسان دوستی کے اسلامی اور غیر اسلامی تصور میں پوری طرح سے فرق نظر آ جائے۔

چنانچہ اس ضمن میں پہلی چیز ہے۔ انسان کی ہستی کا تصور اور کائنات میں اس کا مقام۔ فرمایئے خلیفۃ اللہ اسے کس نے کہا؟ پوری کائنات سے زیادہ جرأت مند اُسے کس نے بتایا؟ برق و باراں کا آقا اسے کس نے بنایا؟ قرآن نے یا کسی اور نے؟ اقبال کہتا ہے ؎

آدمیت احترامِ آدمی — باخبر شو از مقامِ آدمی

پھر ؎

شاخِ نہالِ سدرہ خار و خس چمن مشو — منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

اور پھر ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

گوئٹے کا فاوسٹ، دانتے کی بیاترچے، ملٹن کا مسیح، فردوسی کا رستم، ہومر کا یولیسیز ایک ایک کر کے ان کا جائزہ لیجئے۔ کیا ان میں سے ایک بھی اقبال کے مردِ خود آگاہ کے مقام تک پہنچتا ہے؟ دوسری چیز

لیجئے انسانی برادری کا تخیل۔ آپ ہی بتائیے یہ کس انداز نظر میں زیادہ وسیع اور گہرا ہے۔ اسلامی یا غیر اسلامی میں؟ مغربی قوم پرستی اور اس کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ اٹلانٹک چارٹر دینے والوں کے اعمال آپ سے پوشیدہ نہیں۔ اور پھر اشتراکی نظام ہے۔ کہ اس نے بنی نوع انسان کو دارا و نادار کی تفریق میں مبتلا کر دیا ہے منو مہاراج نے تو اپنی سماجی ضروریات کے پیش نظر ان انسانوں کو چار طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ آج اشتراکی انسان کو مستقل طور پر دو گروہوں میں تقسیم کر رہا ہے۔

تیسری چیز ہے انسانی وجود کی ترکیب۔ اسلامی انداز نظر جسم و روح میں توازن قائم رکھتا ہے۔ اور روح کی تربیت کرتے ہوئے جسم کی ضروریات کو قربان کر دینے کے خلاف ہے۔ برعکس اس کے جمہوری ہو۔ مارکسی ہو۔ کہ فاشسٹی ہر ایک جسم کی دنیا میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ مارکس کا دعویٰ ہے۔ کہ اس نے جسم کے مسائل کو حل کر لیا ہے۔ تو پھر اٹھ کر انسانیت کی معراج حاصل کرنے کو کیوں نہیں بڑھتا؟ "برق و بخارات کے کمالات" تک ہی اپنی پرواز کیوں محدود کر لی ہے؟ افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ نشاۃ الثانیہ کے ظہور سے انسان دوستی کا جو تصور رائج ہوا تھا مغربی دنیا نے اسے جسم کی حدود میں محصور کر لیا۔ اس کا دائرہ عمل تنگ ہو گیا۔ اس کی بنیادیں سطحی بن کر رہ گئیں۔ انگریز اور امریکی انسان دوست ادیبوں۔ کارلائل۔ رسکن۔ ایمرسن وغیرہ نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر وہ مادیت پرستی کے شور و غل میں کھو گئی۔ ہمارے صوفی شعراء انسان دوستی کے معیار کو واقعی اونچا رکھتے چلے آئے ہیں۔ مگر ان کے ہاں ایک خرابی آ گئی تھی۔ انہوں نے یورپ کے برعکس جسم کو قطعی طور پر ترک کر کے روحانی تربیت کا سامان کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے۔ کہ اس طرح وہ ماحول سے ٹوٹ گئے۔ اور ماحول پر ان طاقتوں کا قبضہ ہو گیا۔ جو روحانیت پر مادیت کو ترجیح دیتی تھیں۔ اور جن کے پاس نہ اسلامی انداز نظر کی کسوٹی تھی اور نہ روحانی نصب العین:

آجکل کے طوفانی دور میں انسان دوستی کا معیار دو چیزوں پر قائم ہے۔ جنسی تشنگی اور شکم سیری۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یہ بھی انسانی زندگی کے اہم مسائل ہیں۔ اور ان کا حل تلاش کرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے۔ کہ کیا ہم لوگ واقعی جنسی بھوک میں مبتلا ہیں۔ یا جنسی آزادی کے حامی اپنی مطلب برآری کی خاطر ہمیں اس امر کا یقین دلا رہے ہیں۔ کہ ہم جنسی بھوک سے بے حد لاغر ہو چکے ہیں۔ اور اسی لئے ہم میں اخلاقی بلندیوں تک صعود کرنے کی سکت ہی نہیں رہی۔ اور کہ جب تک اس بھوک کا مداوا نہیں کیا جائے گا ہم اخلاقی پستی کا شکار رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ یورپ کی پیروی میں ہم نے یہ سوال اٹھایا ہے۔ اس لئے یورپ ہی کے تجربے پر غور کرنا چاہیئے۔ کیا وہاں جنسی آزادی مل جانے سے جنسی مسائل خاطر خواہ طور پر حل ہو گئے ہیں؟ یا وہ خود اس جنسی آزادی سے پریشان ہونے لگے ہیں؟ پھر اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ہماری

سرحدات پر جو قبائلی لوگ آباد ہیں۔ وہ جنسی بھوک کے مرض میں کیوں مبتلا نہیں ہوئے۔ ان کے ہاں بھی تو جنسی پابندیاں وہی ہیں۔ جو ہمارے شہروں میں ہیں۔ یہ مرض ہمارے امن شہریوں اور دیہاتیوں میں کیوں پھیل گیا ہے؟ اسی طرح شکم سیری کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر ہم اس کی عدم موجودگی میں اخلاقی پستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ تو امریکہ کے شہریوں کے متعلق کیا فتویٰ دیجئے گا؟ وہاں کے شکم سیر کیوں بداخلاقیوں میں مبتلا ہیں۔ کیا اس ساری گفتگو سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ خرابی اس سے نہیں کہ ہم ان سماجی مسائل کا حل تلاش کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یا قاصر ہیں۔ بلکہ خرابی اس سے ہے کہ ہمارا اندازِ نظر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ جس شاعر اور ادیب کی نگاہیں زندگی کے معمولی پیچ و خم میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں۔ جو جنس اور شکم سیری کے مسائل حل کرنے کے پردے میں جنس کو لذت گیری کی خاطر بازار میں لاتا ہے۔ اور اس طرح اپنی شکم سیری کا سامان کرتا ہے۔ وہ زندگی کی بنیادی صداقتوں تک نہیں پہونچ سکتا۔ ایسا زائر اگر واقعی زائرِ حیات بنکر نکلا ہے۔ تو وہ حیات کے کاخ و کوہ کی زیارت کر سکے گا۔ ایوانِ حیات کا مکمل اور جامع نقشہ اس کے ذہن کی وسعت میں نہیں سما سکتا۔ اور آپ جانتے ہیں۔ کہ مکمل اور جامع نقشے کو ذہن میں لئے بغیر انسانی زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرنا عبث ہے۔ زندگی کے مختلف شعبے آپس میں اس قدر مربوط ہیں۔ اور ایک کا دوسرے پر اتنا انحصار ہے۔ کہ اگر آپ نے کسی ایک کو الگ کر لیا۔ اور اسی کی اصلاح و بہبود کا سامان کرنے لگے۔ تو آپ دوسرے شعبوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ اسلامی اندازِ نظر میں تو یہی خوبی ہے۔ کہ وہ ہر شے کا مقام متعین کرنے سے پہلے اسے زندگی کے پورے نگارخانے میں سجا ہوا دیکھتا ہے۔ اور پھر اس کی حیثیت کے متعلق فتویٰ دیتا ہے۔ چنانچہ اس اندازِ نظر ہی کے ذریعے ہم انسان دوستی کا حقیقی معیار دُنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔

اب لیجئے دوسری بنیادی قدر۔ ادب کا مقصد مسرت بخشنا یا بصیرت عطا کرنا ہے۔ اس سے بھی غالباً کسی ترقی پسند دوست کو انکار نہ ہوگا۔ چنانچہ پہلے یہ دیکھئے کہ مُسرت کا اسلامی معیار کیا ہے۔ اور وہ کہاں تک غیر اسلامی معیار سے مختلف ہے۔ اس تنگ فرصت میں مُسرت کی کیفیت سے مفصل بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ مُسرت کی تین قسمیں ہیں۔ جسمانی۔ ذہنی اور روحانی ایک طرح سے یہ تینوں آپس میں مربوط بھی ہیں۔ لیکن تینوں کے اثرات و نتائج مختلف ہیں۔ مغربی زاویہ نگاہ اس کے متعلق واضح ہے۔ ادب تینوں قسم کی مُسرت دے سکتا ہے۔ اس کا دارومدار ادیب کے اندازِ نظر پر ہے۔ چنانچہ ملٹن اور ورڈز ورتھ نے مذہبی تجربوں کی ترجمانی سے اور ورڈسورتھ نے رُوحِ فطرت کے چہرے سے نقاب کشائی کر کے خاص درجے کے رُوحانی مُسرت کا سامان کیا ہے۔ لیکن یہ روحانی مُسرت ایسی ہے۔ جو انسان کو مطمئن کر کے ایک مقام سے وابستہ کر دیتی ہے۔ یعنی یہ Static قسم کی روحانی مسرت ہے۔ اس کے برعکس رومی اور اقبال Dynamic روحانی مسرت بخشتے ہیں۔ وہ زائرِ حیات

کی تگ و دو کا تھکان ہلکا کر کے اُسے تگ و دو جاری رکھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہی Dynamic مسرت اسلامی اندازِ نظر کی پروردہ ہے۔ وہ روح کی اُمنگوں کو سکون بخشنے کی بجائے اُنہیں اور تیز کر دیتی ہے۔ رہ گئی جسمانی اور ذہنی مسرت تو اس کا مدار بھی ادیب کے اندازِ نظر پر ہے۔ کہیں ڈی۔ ایچ لارنس اور سعادت حسن منٹو دکھائی دیتے ہیں۔ اور کہیں برنارڈ شاہ اور ٹیگور۔ پہلے دو جسمانی مسرت دینے والے ہیں اور دوسرے دو ذہنی۔ اسلامی اندازِ نظر نہ ایک میں ہے نہ دوسرے میں۔ اگر اسلامی قدر دیکھنا ہو تو ذہنی مسرت کے لئے اقبالؒ کا کلام اور جسمانی مسرت کے لئے فردوسی کا کلام دیکھئے۔

اب اسی قدر کے دوسرے پہلو پر غور فرمایئے۔ بصیرت یقیناً مسرت کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ اس لئے بصیرت عطا کرنے والے ادیب کا درجہ ہمیشہ بلند رہا ہے۔ بصیرت عطا کرنے والے ادیب کا مطمعِ نظر صداقت ہوتی ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تمیز نہیں ہو سکتی۔ دونوں اپنی پوری قوت کے ساتھ اس صداقت کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ صداقت ایک اضافی Relative چیز ہے اسے قطعی (absolute) قرار دینا عام طور سے غلط ہے۔ انسان کے مابعد الطبیعاتی تصوّرات پر اس کا بہت کچھ دار و مدار ہے۔ اگر آپ کے مابعد الطبیعاتی تصورات بلند ہیں۔ شخصیت کی گہرائیوں میں اُتر چکے ہیں۔ اور وجدانِ سلیم نے اُنہیں معقول سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ آپ کے نزدیک صداقت کا مقام بھی واقعی بلند ہوگا۔ چنانچہ اس صداقت کی جانب سفر کرتے ہوئے آپ کا ذہن کئی چھوٹی چھوٹی صداقتوں کی نقاب کشائی کرتا چلا جائے گا۔ اگر وہ صداقت اولےٰ تک بھی نہ پہنچے تو بنی نوعِ انسان کے علم و نظر میں بہت کچھ اضافہ کر سکے گا۔ لیکن اگر آپ کے مابعد الطبیعاتی تصورات اونچے نہیں۔ بلکہ آپ مابعد الطبیعاتی تصورات کو فضول سمجھ کر طبیعاتی ماحول سے اوپر اُٹھنا گوارا ہی نہیں فرماتے۔ تو آپ کی صداقت کا مقام بہت اونچا نہیں ہوگا اور آپ اس حد تک پہنچ کر بھی بنی نوع کے علم میں اتنا اضافہ نہ کر سکیں گے۔ جتنا کہ اُس پہلے شخص نے کیا تھا اگرچہ وہ اپنے مقامِ صداقت تک بھی نہ پہونچ سکا تھا۔ چنانچہ اسلام کے مابعد الطبیعاتی تصورات میں سب سے بلند تصور خُدا کا تصور ہے۔ ایک ایسا خُدا جو قوت اور نیکی کا سرچشمہ ہے۔ جو ہر قدرت کی حرکت کا باعث ہے۔ جو روشنی کا ازلی اور ابدی منبع ہے۔ گویا اسلامی شاعر اور ادیب کے تخیل کے سامنے اپنی پرواز آزمائی کا ایک بلند ترین مقام پیش ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس صداقت اولےٰ تک پرواز کرنے کی سمت بھی معین کر دی گئی ہے۔ اور وہ ہے خالص اسلامی اندازِ نظر۔ گویا ایک چھوٹا خالق ایک سب سے بڑے خالق کی بارگاہ میں اس لئے جا رہا ہے کہ تخلیق کے بنیادی اُصولوں سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرے

فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

بصیرت کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی غور طلب ہے۔ کہ بصیرت سکھانے والے میں قومی روایات کا بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ بصیرتی ادب بڑی حد تک قومی روایات کے تار و پود سے نئی صداقتوں کا جامہ تیار کرتا ہے جرمن ادیب اپنی قوم کے ماضی سے درخشاں روایات لے گا۔ انگریز اپنی قوم کے، فرانسیسی اپنی قوم کے، لیکن اسلامی ادیب کہاں سے لے گا۔ اس کے ہاں تو قوم کا تصور ہی نہیں۔ وہ تو جغرافیائی اور نسلی بندھنوں سے آزاد ہے۔ اس کی قوم کہاں اس کے سامنے آئیڈیلز کی روایات ہیں۔ بلند معیارِ زندگی کے کارناموں کی روایات جن کا انحصار کسی ایک قوم یا ملک پر نہیں۔ جو پورے عالم انسانی پر حاوی ہیں۔ جو ہر ملک کے بسنے والوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ روایات کے سلسلے میں اسلامی ادیب کی ایک ہی قدر ہے۔ اور وہ یہ کہ بلند آئیڈیلز کی روایات جہاں بھی ملیں۔ وہ انہیں اپنا لینے کو تیار رہے۔ اسی ایک چیز سے ادب کا دامن بھی کشادہ ہو جاتا ہے۔ اور ادیب کی نظر بے انداز وسعت اختیار کر لیتی ہے۔

آئیے اب تیسری بنیادی قدر "فطرت کی ترجمانی" کا جائزہ لیں۔ قرآن بار بار ہمیں کارخانۂ قدرت پر غور کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے نئے مختلف پہلوؤں کو انسان کے لئے نعمت بتلاتا ہے۔ اور اس عطیہ پر باری تعالیٰ کا احسان جتلاتا ہے۔ یہی نہیں وہ خود بھی اس کے حسین مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے اور ہمیں فطرت کی بوقلمونیوں سے قلب و نظر کا سامان حاصل کرنے کو کہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمیں مظاہرِ قدرت میں والہانہ دلچسپی بھی لینے دیتا جس سے ہماری خودی کو ضعف پہونچے۔ فطرت پر تصرف کرنا انسان کا حق ہے۔ اسے مسخر کر کے ہی وہ صحیح معنی میں منصب خلافت کا مستحق بن سکتا ہے۔ جو قومیں فطرت کے مظاہر میں کھو گئیں۔ جو اس کے حسن کی کشش اور جلال کی عظمت کے آگے جھک گئیں۔ وہ فطرت کی وسعتوں سے باہر نہیں نکل سکیں۔ انسانی فہم کی جولانگاہ محض فطرت ہی نہیں۔ وہ آگے کہیں اور اور ادا ہے۔ لہٰذا فطرت کے حسین یا عظیم الشان مناظر کی وسعتوں میں کھو جانا۔ اسلامی انداز نظر کے خلاف ہے۔ اسلامی آرٹسٹ کا مقام تو یہ ہے۔

جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما ‌ ‌ ‌ ‌ ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما
دلِ ما را باو پوشیدہ راہے است ‌ ‌ ‌ ‌ کہ ہر موجود ممنونِ نگاہے است
گر او را کس نہ بیند زار گردد ‌ ‌ ‌ ‌ اگر بیند یم و کوہسار گردد
جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست ‌ ‌ ‌ ‌ کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست

فطرت کی بے آہنگی میں نظم و ربط پیدا کرنے والا کون ہے؟ شاعر یا ادیب! اسلامی آرٹسٹ کا تو یہ کام ہے۔ کہ فطرت کی شادہ کشی کرے نہ اسے سنوارے۔ اس کے مظاہر میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ اس کا

کلام: خشکی اور خنکی ہوتی ہے۔ جو زندگی کی حرارت کو عام کرنے کے راستے میں حائل ہو جائے۔ میرے خیال میں ایسی توازن کا نتیجہ ہے کہ حقیقی اسلامی آرٹ ایک بلند کلاسیکی آرٹ ہو کر رہا ہے۔ ایسا کلاسیکی آرٹ جو ابدی صداقتوں پر حاوی ہو۔ جو روحانی تشکیک سے پاک ہو۔ جو بقول گوئٹے Romanticism سے یعنی مواد اور اظہار میں توازن بھی نہ رکھتا ہو بلکہ وہ دونوں لحاظ سے بڑے جوہر کا مالک ہو۔ میرا یہ بھی خیال ہے۔ کہ اسلامی قدر اظہار میں جمیل سے Sublime کا درجہ بہت بلند ہے۔ اور اسلامی انداز نظر کو Beautiful سے Sublime مرغوب تر ہے۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ جمال کی دلکشی اپنی طرف کھینچ کر زائر کو اپنے پھندے میں پھنسا سکتی ہے۔ لیکن Sublime جس میں عظمت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ احترام پر تو مجبور کر سکتا ہے۔ مگر اسے اپنے دام میں جکڑا نہیں لیتا۔ اور اگر زائر کا زاویۂ نظر اسلامی ہے۔ تو وہ اس کو دعوت دیتا ہے۔ کہ اپنی موجودہ حیثیت سے مطمئن نہ ہو۔ بلکہ اپنی ذات میں Sublimity پیدا کرے۔ گویا Sublime اسلامی ادیب یا شاعر کو اور بلند اٹھنے۔ وسعت پانے اور عظمت حاصل کرنے کی خاموش تلقین کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی قدر اظہار کی چند اور قسمیں بھی ہیں۔

(۱) اس میں عریانی حرام ہے۔ (۲) تحقیر ناجائز (۳) تضحیک گناہ (۴) تعمیم ناروا (۵) تنقید میں تلخی بدفطرتی کا اظہار۔ آخر میں مجھے اجازت دیجئے کہ میں ایک بنیادی غلط فہمی کا ازالہ کر دوں۔ بعض لوگ یہ کہنے کی جرأت کر بیٹھے ہیں۔ کہ اقبال مرحوم کا مقام تو بے شک بہت بلند ہے۔ مگر انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو ایک تنگ مذہبی دائرے میں محدود کر دیا تھا۔ وہی لوگ آج اس مقالے کے متعلق بھی کہیں گے۔ کہ یہ ادب ایسے ہمہ گیر تخلیقی عمل کا دائرہ تنگ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ ان سے میں صرف اتنا کہوں گا۔ کہ اسلام ایسے ہمہ گیر نظامِ حیات کے زیر اثر جو ادبی قدریں وجود پذیر ہو سکتی ہیں۔ انہیں محدود سمجھنا اور ایک مخصوص ماحول کی پیداوار جاننا یا ایک مخصوص ماحول پر حاوی قرار دینا سب سے بڑی نادانی ہے۔ اسلامی انداز نظر تو یہ ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

طلوعِ اسلام!

صاحب مضمون نے اس عنوان پر غور و فکر کے ساتھ لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ عنوان بہت اہم ہے اور اس پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ مسلمانوں کے ہزار سالہ تاریخ پر غور کریں گے۔ تو یہ حقیقت آپ پر بصد استعجاب منکشف ہو گی۔ کہ اس قوم کے زوال میں جسے تمام نوع انسان کے لئے بہترین اُمت بننا تھا۔ ان کی ادب پرستی کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ استبداد ملوکیت نے ان کے شجرِ حیات کی تمام زندگی بخش رطوبتوں کو چوس لیا۔ لیکن ان پر ملوکیت کا استبداد بھی اس لئے مسلط ہوا۔ کہ انہوں نے زندگی کے حقائق سے فرار کی راہ اختیار کی۔ اور تخیلات کی خوش آئند وادیوں میں کھو کر اور تصورات کی نگاہ فریب پناہ گاہوں میں

جیسا کہ سمجھ لیا۔ کہ اب ہلاکت و بربادی کا آہنی پنجہ ان تک نہیں پہونچ سکتا۔ تاریخ کی روشنی میں اس اہم حقیقت کو سامنے لانا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے لئے فرصت درکار ہے۔ اس مختصر سے شذرہ میں ہم چاہتے ہیں۔ کہ کم از کم ادب کی بنیادی قدر کو واضح کر دیا جائے۔

شاعری یا ادب، قومی، مقامی، لسانی بلکہ ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ قوموں، زبانوں اور جغرافیائی حدود کی تبدیلی سے ان میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ خود مسلم اقوام عرب، ترک، ایرانی، تورانی، افغانی اور ہندی میں بھی شعر و ادب میں امتیازی خطوط کھینچے جا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام "دین" ہے جو انسانیت کے آفاق پہ محیط اور ہمہ گیر ہے۔ وہ کسی مخصوص تمدن، تہذیب اور شعر و ادب سے بالاتر چیز ہے۔ اس کا وظیفہ قلب و ذہن کی اصلاح ہے۔ اس اصلاح سے ہر تمدن ہر تہذیب اور ہر ادب فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے کسی ادب کو اسلامی کہنا ایسا ہی غلط ہے۔ جیسا کسی تہذیب کو اسلامی کہنا۔ شاعری کی حقیقت قرآن نے چند آیات میں واضح کر دی ہے۔ جس سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ شعر اپنے تمام ماہیت میں دین سے متضاد شے ہے۔ اس لئے کہ دین کی اساس حقائق پر ہے۔ اور شاعری کی بنیاد جذبات پر۔ شعر اپنی مقبولیت کے لئے مرغوب ترین جذبات تلاش کرتا ہے اس لئے وہ جھوٹ اور سچ کی تمیز سے آزاد ہے۔ اس وجہ سے اس کی گھٹی میں رندی پڑی ہوئی ہے۔ شاعر کے سامنے زندگی کا کوئی متعین مقصد اور سفر حیات کی کوئی مقررہ منزل نہیں ہوتی۔ وہ (جیسا کہ طلوع اسلام کی ایک سابقہ اشاعت میں جناب پرویز نے لکھا ہے) خیال کی ہر وادی میں چکر لگاتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ کرتا نہیں۔ اس لئے جو لوگ اس کے پیچھے چلتے ہیں۔ وہ رند شرب ہیں۔ شعر جذبات کو عارضی طور پر مشتعل کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن دنیائے انسانیت میں کسی مستقل انقلاب کی اساس نہیں بن سکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے کفارِ عرب جو اسلام کے دشمن تھے۔ اور شعر کی ماہیت سے واقف، جانتے تھے۔ اس لئے جب تک وہ رسول اللہ کو ایک شاعر سمجھتے رہے۔ انہوں نے آپ کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ حضورؐ کے متعلق کہتے تھے۔ "شاعر نتربص بہ ریب المنون" یعنی یہ شخص شاعر ہے۔ کچھ دنوں شعر کہہ کے خود بخود ختم ہو جائیگا۔ اس کا جواب قرآن نے دیا۔ کہ "وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہٗ" نبی کو نہ ہم نے شعر کی تعلیم دی ہے۔ اور نہ ہی یہ اس کے لئے شایان شان ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ان کے پیچھے پیرو اور جادۂ حقیقت کی راہ پر ہیں۔ ان کے لئے بھی شاعری، جو انہیں حقائق اور ممکنات کی دنیا سے تخیلات کی وادیوں میں لے جائے، کبھی شایانِ شان نہیں ہو سکتی۔ اس شاعری اور ادب نے مسلمانوں جیسی کاوش بسینہ قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ دین کی تعلیم میں بھی جذبات ہوتے ہیں۔ جیسے میدانِ جنگ میں مجاہدین کا ولولہ انگیز نعرہ جو رجز کی صورت میں ان کے قلب کی گہرائیوں سے ابھرتا اور فضائے عالم میں تھرتھراہٹ

پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی درست ہے۔ کہ بعض اوقات تبئین حقائق کے لئے موزون انداز بیان زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ یہی وہ اشعار ہیں۔ جنہیں قرآن نے مستثنیٰ فرمایا ہے۔ اس استثنا کو قرآن نے "ذکر اللہ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ جب فرمایا۔ کہ الذین امنوا وعملوا الصالحات وذکروا اللہ کثیرا (۲۶/۲۲۷) اللہ کے ذکر سے مفہوم یہ ہے۔ کہ ان کے سامنے ہر وقت وہ منزل رہے۔ جو اس کی فطرت کے ترجمان (قرآن) نے اس کے لئے متعین کی ہے۔ اور اس کا قدم اس راستہ سے ذرا ادھر ادھر نہ بھٹکے جو اس منزل تک لے جانے کا صراط المستقیم ہے۔ اس کے باوجود اظہار جذبات محبت دینی یا تبیان حقائق کا یہ اسلوب بیان بھی زیادہ سے زیادہ مباح کے حد تک ہے۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ اسلام شعروادب پیدا کرنے کے لئے نہیں آیا۔ اس کی کوئی اپنی مخصوص زبان نہیں۔ نہ اپنا ادب ہے۔ شاعری اور ادب دراصل زندگی سے فرار اور حقیقت سے گریز ہے۔ شاعر کے پاس چند الفاظ اور چند خیالات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ خود بھی بیکار رہتا ہے اور اس کے پڑھنے والے بھی اپنی صلاحیتیں کھو دیتے ہیں۔ وہ خیال کی وادیوں میں آوارہ گردی کرتا ہے۔ اور حیات و عمل سے رشتہ منقطع کر کے صراط المستقیم سے دور جا پڑتا ہے۔ اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر جھوٹی تسلی دے لیتا ہے۔ کہ الشعراء تلامیذ الرحمٰن۔ مسلمانوں کو ہزار برس سے یہی شعروادب تباہ کرتا چلا آ رہا ہے۔ اور ہمارے دور میں اس کی تباہ کاریاں اپنی انتہا تک پہونچ چکی ہے۔ جس نے ہمارے نوجوانوں کو زندگی کے حقائق سے یکسر بیگانہ بنا کر موہوم تصورات کی ان بھول بھلیوں میں گم کر رکھا ہے۔ جن کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں۔ ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم واباؤکم۔ یہ صرف چند نام ہیں جو انہوں نے اور ان کے پیشروؤں نے وضع کر رکھے ہیں۔ ادریس۔

بقیہ لمعات۔ صفحہ ۱۲ سے آگے

دہائی یہ دی جاتی ہے کہ مارڈالا مسلمانوں نے!

یہ ایک وجہ تھی۔ دوسری وجہ کیا ہے؟ سنئے

"اصل معاملہ تو معاشی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو یکساں طور پر متاثر کئے ہوئے ہے"

معاشی مشکلات دونوں کو یکساں متاثر کئے ہوئے ہیں۔ لیکن مسلمان چونکہ اپنی زندگی اور موت اس سرزمین سے وابستہ کئے ہوئے ہے اس لئے وہ وہیں مقیم ہے۔ لیکن چونکہ ہندوؤں کے سامنے۔ ہندوستان کا وسیع علاقہ موجود ہے اس لئے وہ ادھر چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے اس انتقال مکانی کی وجہ جس کی بنا پر اس قدر غوغا آرائی کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جب گذشتہ عید الاضحیٰ کے موقع پر کلکتہ میں بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی قرار دیدی جاتی ہے کہ "اس حادثہ کا ذمہ دار مشرقی بنگال سے ہندوؤں کا اخراج ہے جس نے فطری طور پر بیان انتقام کے جذبات کو مشتعل کر دیا ہے" (ہندوستان ٹائمز ۱۰/۲۶) حالانکہ اسی ہندوستان ٹائمز میں دیگی

لکھا ہے کہ "اس میں شبہ نہیں کہ یہ ہنگامہ، امن کی اس فضا کو برہم کرنے کے لئے جسے گاندھی جی کی کوششوں نے گذشتہ سال پیدا کیا تھا، عمداً برپا کیا گیا تھا۔ لیکن اس افتتاحیہ کا خاتمہ پھر ان الفاظ پر کیا گیا ہے۔

جب تک مشرقی بنگال سے ہندوؤں کی نقل مکانی کا سلسلہ نہیں رکتا اس قسم کے حادثات کو روکنا ناممکن ہوگا۔ خواہ دونوں حکومتیں جتنا جی چاہے زور لگالیں۔

کلکتہ میں مسلمانوں کے اس خونِ ناحق کی خبر جب مشرقی بنگال میں پہنچی تو وہاں کے مسلمانوں کے جذبات کا مشتعل ہو جانا ایک بدیہی امر تھا۔ ڈھاکہ کے مسلمانوں نے ایک جلوس نکالا اور وزیرِ اعظم کے پاس پہنچے کہ وہ مسلمانوں کی اس بیدردانہ قتل و غارت گری کا کچھ تدارک کریں۔ خود ہندوستان ٹائمز کی اطلاع کے مطابق، وزیرِ اعظم مسٹر نورالامین نے مسلمانوں کو "اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے اور امن قائم کرنے کی پرزور تاکید کی" (ہندوستان ٹائمز ۱۸ ۱۱/۴۸) چنانچہ وہاں کسی مسلمان نے کسی ہندو کی طرف انگلی تک بھی نہیں اٹھائی۔ بایں ہمہ اسی ہندوستان ٹائمز نے اس واقعہ پر جب اپنے مقالہ افتتاحیہ میں تبصرہ کیا تو اس میں لکھ کہ

یہ امر سخت پریشانی کا موجب ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے انتقام کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ مطالبہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ مشرقی بنگال کے مسلمان، کلکتہ کے مسلمانوں کے خون کا بدلہ، وہاں کے ہندوؤں سے لینا چاہتے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۸ ۱۱/۴۸)

غرضیکہ کہاں تک لکھتے جائیے۔ یہ ہے وہ قوم جس سے، شومیٔ قسمت سے ہمیں پالا پڑا ہے۔ وہ جو جیسے برنارڈ شا نے کہا تھا کہ "خدا ہمسایہ دے تو نیک دے" وہ ایک بہت بڑی حقیقت کا آئینہ بردار تھا۔ اب آپ غور فرمائیے کہ اس قسم کی قوم کے ساتھ باہمی افہام و تفہیم یا عہد و معاہدہ کی رو سے کوئی بات بھی یقینی طور پر طے کی جا سکتی ہے؟ ان کی کسی بات پر اعتبار بھی کیا جا سکتا ہے؟۔ اس قسم کی قوم کا علاج صرف وہی ہے جس کی طرف ہم کئی بار اشارہ کر چکے ہیں۔ جب کسی اوچھے اور بے اصول انسان کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ وہ فریقِ ثانی سے زیادہ طاقتور ہے تو وہ کبھی نچلا نہیں بیٹھے گا۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ اسے عملاً بتا دیا جائے کہ فریقِ مقابل چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھا ہوا۔ وہ بھی قوت رکھتا ہے۔ جب کسی کا دورانِ خون تیز ہو جائے تو اس کا صحیح علاج اس کی فصد کھول دینا ہوتا ہے۔ یہ اس پر زیادتی نہیں ہوتی۔ اس کے جنون کا علاج اور دوسرے انسانوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھنے کی تدبیر حسنہ ہوتی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہندو کے دماغ سے اس خناس کو نکال دیا جائے کہ پاکستان کا مسلمان کمزور ہے۔ اس کے لئے اگر آپ کے پاس آج طاقت موجود ہے تو ہندو کو اس کا احساس دلا دیجئے (اس پر کسی قسم کی زیادتی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کے دل سے اس کی قوت کا زعمِ باطل نکالنے کے لئے) اور اگر قوت موجود نہیں تو اسے پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دیجئے۔ اس کے لئے دو کام کرنے کے ہیں ایک قوم کے لئے اور دوسرا حکومت کے لئے۔ قوم کے کرنے کا کام یہ ہے کہ جتنا روپیہ کسی کے پاس موجود ہے۔ اس سے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ خریدتا چلا جائے۔ اس طرح یہ روپیہ براہِ راست

عسکری قوت کی فراہمی میں صرف ہوگا۔ اور جب حالات اچھے ہو جائیں گے تو واپس بھی مل جائے گا۔ اور حکومت کے لئے یہ کہ فوجی ٹریننگ عام کردی جائے۔ اگر یہ ہوگیا تو پاکستان کا مسلمان بھی اطمینان سے اپنے مقاصد کے حصول میں منہمک ہو سکے گا۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو وہاں کی ذلت آمیز زندگی سے نکال کر، پاکستان میں بسانے کے لئے آبادی کے تناسب سے مزید خطۂ زمین بھی مل سکے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہندوستان کا مسلمان زیادہ سے زیادہ دس برس میں رفتہ رفتہ بدھ، شودر بن کر رہ جائے گا اور پاکستان کے مسلمانوں کے اعصاب پر ہندوؤں کا ہوا اس طرح سوار رہے گا کہ انہیں رفتہ رفتہ احساس کمتری تباہ کر جائے گا۔ آپ غور سے دیکھئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو من حیث المسلم ختم کرنے کی تدابیر کتنی برق رفتاری سے آگے بڑھائی جا رہی ہیں۔ اس آئین کو دیکھئے جو وہاں آجکل میں زیرِ غور ہے اور کل کو ملک کا قانون بننے والا ہے۔ انگریزوں کے ڈیڑھ سو سالہ عہدِ حکومت میں، مسلمانوں کے شخصی آئین (پرسنل لاء) سے تعرض نہیں کیا گیا۔ مثلاً وہ اپنے معاملات متعلقہ نکاح، طلاق، وراثت، املاک وغیرہ میں مجاز تھے کہ انہیں شریعت کے مطابق سرانجام دیں یا ملکی رواج کے مطابق۔ لیکن ہندو کی نگاہ میں وہاں کے مسلمانوں کی اتنی سی آزادی بھی کھٹکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مجوزہ ضابطۂ آئین میں ایک شق اس عنوان کی بھی شامل کرلی ہے کہ آیندہ مسلمانوں کو اتنی بھی اجازت باقی نہ رہے۔ اس سے ان کا مقصود کیا ہے اس کے لئے مسٹر منشی کے ان الفاظ پر غور فرمائیے جو انہوں نے اس شق کی وضاحت کرتے ہوئے فرمائے ہیں وہ کہتے ہیں کہ

"ہم ملک کے مختلف باشندوں کے شخصی قوانین کو اس لئے یکجا اور یکساں کرنا چاہتے ہیں، تاکہ کچھ عرصے کے بعد تمام ملک کی روشِ زندگی یکساں اور غیر دینی ہو جائے"۔

آپ اسی ایک شق سے اندازہ لگا لیجئے کہ ہندوؤں کی غلامی میں وہاں کے مسلمانوں کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ معترضین کہہ دیں گے کہ ان ہی خطرات کے پیشِ نظر تو ہم تقسیمِ ہند کی مخالفت کیا کرتے تھے! لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے چشم پوشی کر لیتے ہیں کہ اب تو صرف وہاں کے چار کروڑ مسلمانوں پر یہ گزر رہی ہے۔ اگر ملک تقسیم نہ ہوتا تو دس کروڑ مسلمانوں کا یہی حشر ہو کر رہتا۔ یہ قانون کثرتِ آراء سے پاس ہوا ہے۔ آراء کی اکثریت اس وقت بھی ہندوؤں ہی کی ہوتی۔ لہٰذا یہ خطرات تقسیمِ ہند سے پیدا نہیں ہوئے۔ اسکی واحد علت وہ ہندو کی وہ ذہنیت ہے جو مسلمانوں کے خلاف جذباتِ انتقام سے اس قدر زہر آلود ہو چکی ہے کہ اب حقوقیت اور انسانیت کے تقاضوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی نجات کی صورت بھی ملک کی مزید تقسیم ہے۔ اوّل و آخر یہ کرنا پڑیگا۔ لیکن ہندو اس پر کبھی رضامند نہیں ہوگا۔ جب تک اسے قوت کے زور پر رضامند نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کے لئے انفرادی قوت نہ صرف اپنے استحکام اور اپنے آپ کو ہندوؤں کے شرّ و مہ عزائم سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے، بلکہ ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کو شدھ ہونے سے بچانے کے لئے بھی اس کی اشد ضرورت ہے۔ اس انفرادی قوت کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس کا احساس کریں کہ پاکستان ایک ریل گاڑی نہیں جس میں مسافر وہ کا کام اس اطمینان سے ڈبوں میں بیٹھے رہنا ہوتا ہے کہ گاڑی چلانے کی ذمہ داری ڈرائیور اور گارڈ کے سر ہے۔ پاکستان تو وہ کشتی ہے جس میں ہر صاحبِ کشتی کے ہاتھ میں چپّو ہے۔ اس لئے اس کشتی میں ہر شخص کو یہ سمجھنا چاہئے کہ کشتی میرے ہی زورِ بازو سے چلیگی۔ اگر دوسرا شخص بے دلی سے چپّو چلا رہا ہے تو یہ مت کرو کہ تم خود بھی سست پڑ جاؤ۔ خود بھی پوری قوت سے چپّو چلاتے رہو اور اسے بھی سارا زور لگانے کی تلقین کرو۔ [illegible] خود ثابت قدم رہو اور دوسروں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرو۔ ایک ٹیم کی طرح کام کرو اور اپنی ذمہ داری کے لئے اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھو کامیابی کا یہی ایک طریق ہے۔

نقد و نظر

"غُبارِ خاطر"

(مجموعہ مکاتیب ابوالکلام صاحب آزاد)

تنقید ایک مشکل فن ہے۔ اور طنزیہ تنقید مشکل تر۔ ہمارے ہاں ابھی تک مِن مزاح اور استہزاء میں بہت کم تمیز کی جاتی ہے۔ اسی طرح تنقید اور تنقیص کا امتیاز بھی شاذ ہے۔ اسی ماہ اتفاق ہے، ہمارے سامنے طنزیہ تنقید کا ایک ایسا نمونہ آیا ہے جس کی لذت میں قارئین طلوع اسلام کو شریک کرنا بخل ہوگا۔ دوسروں کے ہاں شائع شدہ مضامین طلوع اسلام میں بہت کم جگہ پاتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ اس میں کچھ عار سمجھتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کا ایک اپنا مخصوص انداز ہے۔ اور جو مسائل حاضرہ اس کے سامنے آتے ہیں اس کا مختصر سا دامن ان کے لئے بھی بمشکل گنجائش نکال سکتا ہے۔ لیکن اس تنقید میں اس کی بھی استثناء کی گئی ہے۔

محترم ممتاز حسن صاحب حکومت پاکستان کی وزارتِ مالیات کے ایک ممتاز رکن ہیں اور ان کا کمال یہ ہے کہ "دو اور دو چار" کے اس خشک ماحول میں ذوقِ سلیم اور حسِ لطیف کو اس طرح تازہ اور شگفتہ رکھتے ہیں جس طرح صحارو یا بس ریگستان میں ایک متبسم لالۂ صحرا۔ انہوں نے ابوالکلام آزاد کے مجموعہ مکاتیب پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ اور اس کے نتائج کو حلقۂ اربابِ ذوق (کراچی) کے ایک اجتماع میں پیش کیا۔ جواب ان کے ہاں سے شائع شدہ مجموعہ مضامین میں شامل ہے۔ (اس مجموعہ میں یہی ایک کام کی چیز ہے) جس اجتماع میں یہ مقالہ پڑھا گیا تھا۔ اس میں اس پر حسب دستور[ؔ] میں محاکمانہ تبصرہ ہوا تھا

ممتاز حسن صاحب کا مضمون ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ اس میں تصویر کے دونوں رُخ موجود ہیں۔ بلکہ اس نئے طنزیہ لہجے کے انداز کیلئے جو اُردو میں ایک نئی چیز ہے۔ ایسی کامیاب طنز کہ کوئی وار اوچھا نہیں پڑتا اور باوجود اس کے کہ گھاؤ بہر بار گراں لگتا ہے تلوار پر لہو کا نشان تک نظر نہیں آتا۔ اندازِ بیان کی یہ انوکھی خوبی ہے کہ صاحب مضمون نے مخالفین کے مُنہ سے جو باتیں کہلوائی ہیں وہ دراصل ان کی اپنی ہیں۔ اور وہی وزنی اور جاندار ہیں۔ اور ان کے جواب کے طور پر جو اپنی طرف سے کہا ہے وہ مولانا کے

موافقین کے طرزِ استدلال کا خاکہ ہے۔"

بیٹھئے اب آپ اس تنقید سے خود لطف اندوز ہو جیئے۔

(مدیر طلوع اسلام)

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف "غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ مئی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ تین مہینے بعد دوسرا ایڈیشن نکلا۔ اور اب تیسرا ایڈیشن بھی چھپ گیا ہے۔

(۲) کتاب چھبیس ۲۶ خطوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں چوبیس خط مولانا آزاد کی طرف سے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علیگڈھ کے نام ہیں۔ اور دو خط نواب صاحب کی طرف سے مولانا کے نام۔ مولانا کے خطوط میں سے بیس خط ایسے ہیں جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں قلمبند فرمائے۔ ان میں انیس ۱۹ خط پہلے ایڈیشن میں چھپے تھے۔ بیسویں خط کا اضافہ تیسرے ایڈیشن میں کیا گیا۔ ان بیس خطوط کے علاوہ ایک خط اسیری سے کچھ دن پہلے کا ہے۔ اور باقی تین خط رہائی کے بعد کے ہیں۔

خطوط کے علاوہ ایک مقدمہ ہے۔ جسے مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری مولوی محمد اجمل خاں صاحب نے لکھا ہے۔ ایک دیباچہ بھی ہے۔ جو خود مولانا کے قلم سے ہے۔

(۳) مولانا ۹ راگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں گرفتار ہوئے۔ اور ۱۵ رجون ۱۹۴۵ء کو بانکوڑا میں رہا کئے گئے۔ مگر "غبارِ خاطر" میں اسیری کے زمانے کے مکتوبات میں آخری مکتوب ۱۶ رستمبر ۱۹۴۳ء کا ہے۔ اس کے بعد زمانۂ اسیری میں مولانا نے معلوم ہوتا ہے نواب صاحب کے نام کوئی خط نہیں لکھا۔ مولانا کے ارشاد کے مطابق ان مکتوبات کا سلسلہ رک جانے کی وجہ ان کی اہلیہ محترمہ کی وفات تھی۔ جو اپریل ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ مولانا کے مکتوب مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۵ء سے جو انھوں نے رہائی کے بعد لکھا ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اس سانحہ کے بعد بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ ان کے تین خط مورخہ ۱۴ رجون، ۱۵ رجون اور ۱۶ رستمبر ۱۹۴۳ء مجموعے میں شامل ہیں۔ ۱۶ رستمبر والا خط جس میں مولانا کی غنا اور موسیقی سے دلبستگی اور دوسری جمالیاتی دلچسپیوں کا ذکر ہے۔ خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔ کیونکہ یہ خط اپنی شگفتگی اور رنگینی کے اعتبار سے اس مجموعے میں بے نظیر ہے۔ اور پڑھنے والا ایک خوشگوار استعجاب کے ساتھ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ قلعہ احمد نگر کی افسردہ فضا اور اپریل کا سانحۂ جانکاہ اس مکتوب کے کیف و سرور پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔

۴۔ مولانا کے اسیری کے زمانے کے خطوط کے متعلق یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے۔ کہ یہ خطوط لکھتے وقت انہی کو معلوم تھا۔ کہ انکی تحریریں مکتوب الیہ تک نہیں پہنچیں گی۔ اور یہ بھی ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔ کہ انھوں نے ان خطوط کو نواب صاحب تک پہنچانے کی کوشش بھی کی ہو۔ باوجود اس کے مولانا نے اگست ۱۹۴۲ء اور ستمبر ۱۹۴۳ء کے

درمیان کے عرصے میں، مبینہ مکتوب نواب صاحب کے نام تحریر فرمائے۔ اس سے بھی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جب حکومتِ برطانیہ نے مولانا کو آزاد کیا اور ان کے لکھے ہوئے خطوں کے لئے مکتوب الیہ تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ تو اس وقت بھی وہ قلمی خطوں کی صورت میں نواب صاحب کو نہیں بھیجے گئے، بلکہ نواب صاحب نے بھی انہیں اسی شکل میں دیکھا جیسے ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ یعنی چھپی ہوئی کتاب کی صورت میں۔ اس دلچسپ حکایت کو خود مولانا کی زبان حقیقت ترجمان سے سنئے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۵ء کے خط میں نواب صاحب کو تحریر فرماتے ہیں۔

"۱۵ جون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا۔ تو تمام مکتوبات اور فائل نکلے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیئے خیال تھا کہ انہیں حسبِ معمول نقل کرنے کے لئے دے دوں گا اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ لیکن جب مولوی اجمل خان کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مصر ہوئے کہ انہیں بلا تاخیر اشاعت کے لئے دینا چاہیئے۔ چنانچہ ایک خوشنویس کو شملہ میں بلایا گیا۔ اور پورا مجموعہ کتابت کے لئے دیدیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے۔ اور امید ہے کہ عنقریب طباعت کے لئے پریس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اب میں ان مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجوں گا۔ مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کروں گا۔"

یہی نہیں بلکہ کتاب کے چھپنے سے پہلے ایک خط جس کا ذکر خود مولانا نے کیا ہے، اخباروں میں بھی چھپ چکا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"شملہ میں اخبار مدینہ بجنور کے ایڈیٹر صاحب آئے تھے۔ انہوں نے مولوی اجمل خاں صاحب سے اس سلسلے کے پہلے مکتوبات کی نقل لے لی تھی۔ وہ اخبارات میں شائع ہو گیا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ "صدیق مکرم" کے خطاب سے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا۔

چشمم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود"

مولانا کے جن خطوں میں سے مندرجہ بالا اقتباسات لئے گئے ہیں ان کا جواب "غبارِ خاطر" کے مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ نواب صاحب مولانا کی پیش کردہ توجیہہ سے مطمئن ہوئے یا نہیں۔ بہرحال یہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کہ "صدیق مکرم" کا خطاب نواب صاحب سے خاص ہے۔ دوست احباب کی مراسلت میں اسی قسم کے رموز جنہیں عشق و محبت کے "کوڈ ورڈ" کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہیں۔

(۵) بعض احباب کی زبان سے، جو انسانی نفسیات کے مطالعے کا شوق رکھتے ہیں۔ یہ رائے سننے کا اتفاق ہوا، کہ ممکن ہے ابتدا ہی سے مولانا کے تحت الشعور میں ان مکتوبات کی عام اشاعت کا جذبہ انہیں مکتوب الیہ تک پہنچانے کے جذبے پر غالب رہا ہو۔ اور جب مولوی اجمل خان صاحب نے مولانا صاحب سے اشاعت کا ذکر چھیڑا ہو، تو بقول کسے "اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ" ہوا ہو۔ بعض دوسرے اصحاب کا جنہیں نفسیات کے مطالعہ سے چنداں دلچسپی نہیں ہے یہ ارشاد ہے کہ معاملہ مولانا کے تحت الشعور سے نہیں بلکہ شعور سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی مولانا ان مکتوبات کو چھپوانے کا شروع ہی سے ارادہ رکھتے تھے اور اس بارے میں مولوی اجمل خاں صاحب کے بیان کردہ اصرار کی واقعیت، یا بہرحال اس کی اہمیت محل نظر ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ خطوط محض ایک دیرینہ دوست ہی کے لئے لکھے جاتے، تو ان میں مولانا کی اپنی طبیعت، زندگی کے واقعات اور عادات و خصائل کے متعلق ان تعارفی تفصیلات کی ضرورت نہ پیش آتی جو خطوط میں موجود ہیں۔ جب دو آدمیوں کی دوستی چالیس سال پرانی ہو جائے۔ تو وہ عموماً ایک دوسرے کے حالات و معمولات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ اگر یہ خطوط واقعی نواب صدر یار جنگ جیسے جید عالم کے نام لکھے جاتے تو ان میں مآثر الامرا اور مرأت الخیال وغیرہ جیسی مشہور فارسی کتابوں کے مضامین اور واقعات کو دہرانا تحصیل حاصل تھا۔ کیونکہ اس قسم کی کتابیں جب انگریزی خوانوں کے طبقے سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں، تو پرانی روش کے علماء و فضلا کے لئے جن میں نواب صدر یار جنگ ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں یقیناً "پیش پا افتادہ سی چیز" ہونگی۔

(۶) میری گذارش ان معترضین سے یہ ہے کہ وہ قطعی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیں، کہ مولانا آزاد ایک بلند پایہ ادبی آرٹسٹ ہیں۔ اور رومانی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور آرٹ اور رومانیت کا مقام وہ مقام ہے۔ جہاں حقیقت اور افسانے کی سرحدیں ملتی ہیں۔ آرٹ کی دنیا کے حقائق عام طبیعی دنیا کے حقائق سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور ایک آرٹسٹ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ جس چیز کو عام انسان طبیعی دنیا کے ناممکنات میں سے سمجھتے ہیں اسے اپنے فن کی سحرکاری سے آرٹ کی دنیا میں ایک ممکن بلکہ واقعی حقیقت کے روپ میں پیش کرے۔ مثال کے طور پر انگریز مصنف سوفٹ کی تصنیف "سفرنامہ گلیور" کو لیجئے۔ اگر آپ محقق بنکر "لی لی پٹ" یا "براب ڈنگ ناگ" کی جغرافیائی تحقیق کرنا شروع کردیں، اور خود بنفس نفیس ان ملکوں کی سیاحت فرمانا چاہیں۔ تو آپ یقیناً مایوس ہوں گے۔ لیکن اگر آپ سوفٹ کے "دبستان" میں جناب گلیور کے ساتھ ساتھ پا بہ رکاب ہوں، تو یقیناً وہ سب مناظر آپ بھی دیکھیں گے۔ جو گلیور صاحب کی آنکھوں نے دیکھے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک آرٹسٹ سے یہ مطالبہ کرنا کہ اس کا ہر بیان ایک اتفاقی حقیقت کا حامل ہو کچھ زیادتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ مولانا آزاد کا ارادہ شروع سے ان مکاتیب کی اشاعت کا تھا یا نہیں۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ التفاتات جو مولانا

کے قول کے مطابق اشاعت کے محترک ہوئے۔ اور ان میں مولوی اجمل خاں صاحب کا اصرار بھی شامل ہے۔ رومانی آرٹ کی دنیا کے حقائق میں سے ہیں۔ آرٹ اور رومانیت کی دنیا کا طبیعی دنیا کے واقعات سے جو تعلق ہے اسے ذہن نشین کرنا مولانا آزاد کی نگارشات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ "غبار خاطر" ہی کو لیجئے۔ اس کے آخری خطوط میں چڑیوں چڑوں کے باہمی اور خود حضرت مولانا سے معاملات کا تذکرہ ہے۔ یہ حکایات شائد بعض پڑھنے والوں کو محض افسانہ معلوم ہوں۔ لیکن اگر ایک دفعہ مولانا کے رومانی تخیل کے صحیح مقام کا اندازہ کر لیا جائے تو حقیقت اور افسانے کے امتیاز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) مولانا کے خطوں کے سلسلے میں نواب صاحب کے ان دو خطوں کا جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ نواب صاحب ایک کبیر السن اور محترم بزرگ ہیں۔ مگر ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخوخت نے ان کی طبیعت کو افسردہ نہیں کیا۔ اور ابھی تک شباب کی رنگین طبعی ان میں موجود ہے۔ ان کے دونوں خطوط کا انداز عشق آمیز ہے۔ پہلے خط میں انھوں نے مولانا کے لئے "بدر کامل" اور "پیکر محبوب" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں اور مولانا کے مکتوب گرامی کو "ترانۂ محبت" کے حسین الفاظ سے یاد کیا ہے۔ دوسرا خط منظوم ہے تین اشعار ملاحظہ ہوں۔ ع

محو نظارۂ گلمرغ نگارے دارم — کز خیالش بہ دل زار بہارے دارم
اے نسیم سحری گر بحضورش گزری — عرضہ دہ شوق کہ در جان نگارے دارم
در بہ پرسد کہ مگر شوق پیامم دارد — سرفرو آر و بزن گوئے گرارے دارم

مولوی اجمل خاں صاحب کے قول کے مطابق نواب صاحب کی مولانا سے ۱۹۰۶ء سے دوستی ہے جب مولانا کے دورِ شباب کا آغاز تھا۔ اور مولوی صاحب کے الفاظ میں ایک کم چالیس برس (۱۹۴۲ء میں ایک اوپر چالیس برس) اس رشتۂ اخلاص و محبت پر گزر چکے ہیں۔ عام حالات میں دو سن رسیدہ بزرگوں کی مکاتبت میں اس قسم کی عاشقانہ گرمجوشی تحلیل نفسی کے بعض ماہرین کو شاید کھٹکے مگر میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ محض چند الفاظ و تراکیب کی بنا پر جو عاشقانہ مگر رسمی شاعری کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کی دلی کیفیات کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کیا جا سکتی اور نواب صاحب کے خطوں کی رنگین نظم و نثر کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ مولانا سے اُن کا تعلق دیرینہ اور بے تکلفانہ ہے۔

(۴) اس موقعے پر مولوی اجمل خاں صاحب کے دیباچے کا ذکر کرنا بھی بیجا نہ ہوگا۔ یہ دیباچہ اپنی ادبی خوبیوں کے اعتبار سے حیرت انگیز ہے۔ مولوی اجمل خاں صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مولانا کے انداز بیان کا تعارف کرانے میں خود مولانا کا انداز تحریر اس کامیابی سے اپنایا ہے کہ بے اختیار داد دینے

کو جی چاہتا ہے۔ وہی رنگین اور مرصع نثر ہے۔ اور وہی ذوقِ شعر، وہی تشبیہات اور استعارات کی فراوانی اور وہی فقروں اور جملوں کی صوتی شان و شکوہ۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا۔ کہ دیباچے میں مولانا کی ذات گرامی کے متعلق جذبۂ عقیدت کا جو وفور ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو ارباب نظر کو ضرور یہ دھوکا ہوتا کہ اگرچہ نام اجمل خاں ہے، کلام ابوالکلام ہی کا ہے۔ یہ دیباچہ مولوی اجمل خاں صاحب کی ادبی شہرت کو مستقل طور پر قائم کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور اگر ان کا قلم اسی روش پر گامزن رہا تو یقیناً ابوالکلام ثانی کہلائیں گے۔

(۹) "غبار خاطر" کے مکتوبات کو ان کے نفسِ مضمون کے اعتبار سے دیکھا جائے تو چھبیس خطوں میں سے دو تین کو چھوڑ کر باقی خطوں کا جو ساڑھے تین سو صفحے کی کتاب میں ڈھائی سو سے زیادہ صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں، مضمون خود مولانا کی ذات گرامی اور ان کے حالات و معمولات سے متعلق ہے۔ باقی سو صفحوں پر کچھ علمی اور تفریحی تذکرے ہیں۔ یہ سب خطوط اپنے طرز تحریر اور نفسِ مضمون دونوں کے اعتبار سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں مولانا کے اسلوب کی چند خصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا بالعموم سادگی کی بجائے رنگینی کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ اور فارسی اور عربی کی خوشنما ترکیبوں تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مولانا کی نثر میں شعر کثرت سے آتے ہیں۔ وہ نثر میں سنجیدہ اور فکری اسلوب پر خطیبانہ جوش و خروش اور ڈرامائی ولولہ انگیزی کو ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔ اور ان کی نثر میں اشعار کی کثرت بھی ان کے اندازِ خطابت کی تکمیل و تزئین کا ایک ذریعہ ہے۔ "غبار خاطر" میں یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ ہر چند بیان روزمرہ کی بے آب و رنگ چیزوں کا ہو مولانا انہیں شعر و رومان کے لباس میں اس انداز سے جلوہ گر کرتے ہیں کہ ان کی اصلی صورت پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"مارا زبانِ شکوہ ز بیداد چرخ نیست   از ما خطے بہ مہر خموشی گرفتہ اند

صدیق مکرم! وہی صبح چار بجے کا وقت ہے۔ صراحی لبریز ہے۔ اور جام آمادہ! ایک دور ختم کر چکا ہوں۔ دوسرے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است   صراحیِ مئے ناب و سفینۂ غزل است

جریدہ رو کہ گذرگاہِ عافیت تنگ است   پیالہ گیر کہ عمر عزیز بے بدل است

طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکر این و آں سے بکلی آسودہ ہے"

حقیقت اس کی صرف اتنی ہے۔ کہ مولانا کمرے میں بیٹھے چائے دانی سے پیالی میں چائے انڈیل رہے ہیں۔

ایک اور موقع پر طبیعت کی فرحت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"جب حسبِ معمول علی الصباح اُٹھا اور جام و مینا کا دور گردش میں آیا، تو ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دور ہو گیا ہو، اور افسردگی اور تنگی کی جگہ انشراح و شگفتگی دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہو"۔

یہی مضمون اگر ایک عام انسان ادا کرنا چاہے تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہ لکھ سکے۔ کہ صبح اُٹھ کر چائے پی تو دل خوش ہو گیا۔

مولانا کے اندازِ تحریر میں خطیبانہ جوش و خروش کی مثالیں "غبارِ خاطر" میں کثرت سے ملتی ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ مولانا کلکتہ میں ایک خاص قسم کی چینی چائے پیتے تھے۔ گرفتاری کے بعد احمد نگر کے بازار میں اس چائے کا ملنا ممکن نہ ہو سکا۔ اب اس بظاہر سیدھے سادے واقعے پر مولانا کے بیان کا جوشِ خطابت ملاحظہ ہو:-

صدیقِ مکرم! وقت وہی ہے، مگر افسوس وہ چائے نہیں ہے۔ جو طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار　　　رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

وہ چینی چائے جس کا عادی تھا۔ کئی دن ہوئے ختم ہو گئی۔ اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گرانمایہ سے آشنا نہیں۔

یک نالۂ مستانہ ز جائے نشنیدیم　　　ویراں شود آں شہر کہ میخانہ ندارد

مجبوراً ہندوستان کی اس سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں۔ جسے تعبیر و تسمیہ کے اس قاعدے کے بموجب کہ

برعکس نہند نام زنگی کافور

لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں

درماندۂ صلاح و فسادیم الحذر　　　زیں رسم ہا کہ مردم عاقل نہادہ اند

اس کارگاہِ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں کہ کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلالِ صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا۔ کہ دُرد کدورت اپنی تہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا۔ اور خندۂ بہار کے پیچھے ہمیشہ گریۂ خزاں کا شیون ہوا۔ ابوالفضل کیا خوب کہہ گیا ہے۔

قدحے پُر نہ شد کہ تہی نہ کردند　　...　　وصفحہ تمام نہ شد کہ ورق برنہ گردید

مثال ضرور موجود ہے جہاں مولانا کا انداز بیان سادہ اور موثر ہے۔ ۱۱ اپریل کے خط میں جو انھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کی وفات کی خبر سنکر قلمبند فرمایا، ایسے کئی مقامات ہیں۔ انھوں نے گرفتاری سے پہلے بمبئی جاتے وقت مرحومہ سے وداع ہونے کا منظر یوں کھینچا ہے۔

"تین اگست کو جب بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کیلئے آئی۔ میں نے کہا۔ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا!"

مجھے اس سے انکار نہیں کہ اردو نثر کا مستقبل سادگی اور اختصار سے وابستہ ہے۔ مگر جب مولانا ابوالکلام آزاد جیسا اہل قلم اس راستے کو اختیار کرنا پسند نہ کرے تو اسے روکا بھی نہیں جا سکتا۔

(۱۱) مولانا کی نثر میں اشعار کی کثرت کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ "غبار خاطر" میں بھی حسب معمول اشعار کی کثرت ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات کی کتاب میں کوئی پانچسو کے قریب اردو، عربی اور فارسی کے اشعار ہیں۔ اور ڈیڑھ سو اوپر مصرعے، بعض اشعار مولانا کو اتنے مرغوب ہیں۔ کہ وہ انھیں بار بار استعمال فرماتے ہیں۔ اچھا شعر جب انھیں یاد آتا ہے تو وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ اسے نقل کرکے اپنی نثر کی رونق بڑھائیں چڑے چڑیا کی کہانی میں چڑوں سے جنگ و مقابلے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں میر کا یہ شعر زبانوں پر چڑھ کر بہت پامال ہو چکا ہے۔ تاہم موقعہ کا تقاضا ٹالا بھی نہیں جا سکتا۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر　　　مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

"غبار خاطر" کے اشعار کے متعلق اہل نظر کی دو رائیں ہیں۔ ایک نقاد ان اشعار کی موزونیت اور موقع محل سے مناسبت کی داد دیتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ یہ اشعار مولانا کی نثر میں اس طرح سے آئے ہیں۔ جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہو۔ اس رائے کے برعکس نقادوں کے ایک طبقے کا یہ خیال ہے کہ اگرچہ اشعار کا انتخاب عام طور پر پاکیزہ اور بلند پایہ ہے۔ مگر بار بار ان کا استعمال اس خاص مقام پر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مولانا کے نقل کردہ اشعار پر ان کے نزدیک یہ اعتراض تین حیثیتوں سے وارد ہوتا ہے۔ اول یہ کہ بہت سے اشعار ایسے ہیں۔ جن کی حیثیت محض تکرار ماسبق کی ہے۔ یعنی مولانا پہلے ایک مضمون نثر میں بیان فرماتے ہیں اور پھر اسی مضمون کو شعر کی صورت میں دہرا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ نثر محض منقولہ شعر کی تمہید معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

"اچانک کیا سُنتا ہوں، بلبل کی نواؤں کی صدائیں آرہی ہیں۔

باز نوائے بلبلاں عشق تو یاد می دہد"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:۔

"زندگی میں جتنے جرم کئے ان کی سزائیں پائیں۔ سوچتا ہوں تو ان سے کہیں زیادہ تعداد ان جرموں کی تھی۔ جو نہ کرسکے۔ اور جن کے کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ گناہوں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں۔ لیکن ناکردہ جرموں کی حسرتوں کا صلہ کس سے مانگیں؟

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے"

نقادوں کے اس طبقہ کا دوسرا اعتراض یہ ہے۔ کہ مولانا نے بہت سے اشعار ایسے استعمال کئے ہیں۔ جن کو ان کے مواقع اور محل سے کوئی معنوی تعلق نہیں۔ محض لفظی مناسبت ہے۔ مثلاً، ۲ جنوری ۱۹۴۳ء کے خط میں سردی کے موسم سے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

معلوم نہیں بہشت کے موسم کا کیا حال ہوگا۔

وہاں کی نہروں کا ذکر بہت سننے میں آیا ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں گرمی کا موسم نہ رہتا ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

یہاں مولانا کی نثر اور غالب کے شعر میں صرف لفظ بہشت کا اشتراک ہے ورنہ موضوع دونوں کا بالکل مختلف ہے

اسی طرح سے اس خط میں ارشاد ہوا ہے۔

"بارہا ایسا ہوا۔ کہ اس خیال سے کہ سردی کا زیادہ سے زیادہ احساس پیدا کروں۔ جنوری کی راتوں میں آسمان کے نیچے بیٹھ کر جاڑے جیتا رہا۔ اور اپنے آپ کو اس دھوکے میں ڈالتا رہا کہ آج سردی خوب پڑ رہی ہے۔

از یک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم"

یہاں وجہ اشتراک نثر میں "دھوکے" کا اور شعر میں "دروغ" کا لفظ ہے۔

تیسرا اعتراض جو مولانا کے استعمال اشعار پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "غبار خاطر" میں ایسے موقع بھی آتے ہیں۔ جہاں شعر اور نثر کے درمیان سرے سے کوئی تعلق ہوتا ہی نہیں۔ نہ تکرار ما سبق کا نہ لفظی مناسبت کا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدتمندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا۔ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا

سے بالکل الگ ہوجاؤں۔ اور کوئی آدمی آکر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے لوگ یہ کمیاب جنس ڈھونڈھتے ہیں اور ملتی نہیں۔ مجھے گھر بیٹھے ملی اور اس کا قدر شناس نہ ہوسکا۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا   یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں"

اس قسم کی ایک مثال یہ بھی ہے۔

"ایک مرتبہ قید کی حالت میں ایسا ہوا۔ کہ ایک صاحب نے جو میرے آرام و راحت کا بہت خیال رکھنا چاہتے تھے۔ مجھے ایک کوٹھری میں تنہا دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً تیار ہوگیا۔ کہ مجھے ایسی جگہ رکھے۔ جہاں اور لوگ بھی رکھے جاسکیں۔ اور تنہائی کی حالت باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان حضرت سے کہا۔ آپ نے مجھے راحت پہنچانی چاہی۔ مگر آپ کو معلوم نہیں۔ کہ جو تھوڑی سی راحت یہاں حاصل تھی وہ بھی آپ کی وجہ سے اب چھینی جارہی ہے۔ یہ تو وہی غالب والا مقولہ ہوا۔

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر   اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھکو ڈبو آئے"

(۱۲) یہ اعتراضات بظاہر بہت وقیع معلوم ہوتے ہیں۔ مگر میں معترض حضرات کی خدمت میں ادب سے عرض کروں گا۔ کہ جہاں تک تکرار ماسبق کا تعلق ہے وہ مولانا کے انداز خطابت کا ایک لازمی جزو ہے۔ اور اس تکرار سے مولانا کو اپنی عبارت میں ولولہ کی کیفیت پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لفظی مناسبت والے اشعار کے متعلق معترضین بھی اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ آخر کچھ نہ کچھ مناسبت تو موجود ہے۔ باقی رہا اشعار کے قطعاً بے محل ہونے کا اعتراض۔ اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا۔ کہ اگر یہ بھی مان لیا جائے۔ کہ غبار خاطر میں بعض جگہ مولانا کی نثر اور منقولہ اشعار آپس میں کوئی ربط نہیں رکھتے۔ تو بھی کسی نکتہ چیں کو اس مسلمہ حقیقت سے مجال انکار نہیں ہوسکتی کہ مولانا کی پہلی تصنیفات میں جو بحیثیت مجموعی غبارِ خاطر سے کہیں زیادہ ضخیم ہیں، مولانا کی نثر کے بعد شاعر خود بولتا ہوا آتا ہے۔ اگر غبار خاطر میں یہ معیار قائم نہیں رہ سکا تو اسے جیل کی پابندیوں اور مرغوب طبع کتابوں کے بہم نہ پہنچنے پر محمول کرنا چاہیئے۔ مزید برآں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولانا کے منقولہ اشعار کم از کم دس میں سے نو کی نسبت کے ساتھ اعلیٰ درجے کے ذوقِ سخن کا ثبوت نہیں دیتے۔ جب صورت یہ ہے۔ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اگر معترضین کے قول کے مطابق مولانا کا شوقِ شعر کبھی کبھی ان کے ذوقِ شعر پر غالب آجاتا ہے۔ تو اسے کیوں ناقابلِ معافی گردانا جائے۔

(۱۳) مولانا کے نقل کردہ اشعار کی ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ عام طور پر معاصرین سے قطع نظر کرکے قدیم اساتذہ کے کلام سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غبار خاطر میں صرف ایک جگہ کسی معاصر شاعر کا ایک شعر نقل فرمایا ہے۔ اور وہ اقبالؔ کا یہ شعر ہے۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

یا ایک مقام پر خود اپنا شعر درج فرمایا ہے ؎

غنچوں میں اہتزاز ہے پروازِ حسن کی سینچا تھا کس نے باغ کو بلبل کے خون کو

(۴) غبارِ خاطر کے نفسِ مضمون کے متعلق یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ مولانا کی ذہنی توجہ کا رخ بیشتر خود اپنی ذات کے احوال و کوائف پر مرکوز ہے۔ مثلاً مولانا ہمیں بتلاتے ہیں کہ وہ اپنے والد مرحوم اور والد مرحوم کے نانا کی طرح صبح کے ۴ بجے اٹھتے ہیں۔ یاسمین سفید WHITE JASMINE نام کی چینی چائے روسی فنجان میں پیتے ہیں مٹھاس سے انھیں نفرت ہے اور گرمی کے موسم سے بھی۔ اس کے علاوہ انھیں اپنی سیرت کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات اور زندگی کے مختلف غیر اہم واقعات بیان کرنے میں خاص لطف آتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کی حیرت انگیزی سے متاثر ہیں۔ عام لوگوں کی پیروی اپنے لئے جائز نہیں سمجھتے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ کہ میری طبیعت زندگی کے اکثر مسائل میں سوادِ اعظم کے مسلک کے خلاف رہی ہے۔ ایک اور مقام پر اپنے فلسفیانہ شکوک اور مذہب کے عام تصور سے اپنی بیزاری کا ذکر کرتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا ہے۔ کہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود جو روایتی مذہب کا علمبردار تھا۔ ان کے شکوک خدا جانے کیسے پیدا ہوئے اور کہاں سے آئے وغیرہ وغیرہ۔ مولانا کا اپنی ذات سے استغراق اس حد تک تو ضرور مسلّم ہے لیکن جب لوگ اس حد سے آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں۔ کہ مولانا کی نفسی کیفیت اس مریضانہ کیفیت سے مشابہ ہے۔ جسے انگریزی میں (NARCISSISM) کہتے ہیں۔ اور جسے اردو میں شاید نرگسیت کہنا ناموزوں نہ ہو تو یہ ان کی زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ (NARCISSISM) کی یہ کیفیت عام طور پر نوجوانوں پر وارد ہوتی ہے۔ ابتدائے شباب میں ہر نوجوان اپنی نفسی کیفیات کو دیکھ کر یہی سمجھتا ہے۔ کہ اس قسم کے واردات کسی اور انسان کو نصیب نہیں ہوئے مگر جب عمر کا سفر ابتدائے شباب سے زندگی کے دوسرے مرحلوں تک ہوتا ہے تو عام انسانوں کو اپنی ذاتی قابلیت اور صلاحیت کے جانچنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور ان کے خیالات میں توازن اور سنجیدگی آجاتی ہے۔ نکتہ چینیوں کا کہنا ہے۔ کہ مولانا اس "نرگسیت" اور خود پرستی کی ابتدائی کیفیت سے گزر کر واقعیت کی منزل میں داخل نہیں ہوئے۔ مجھے اس قسم کے اعتراض سنکر تعجب ہوتا ہے۔ ہمیں اس وقت ایک رومانی آرٹسٹ کے کوائف ذہنی سے واسطہ ہے۔ نہ کہ کاروباری دنیا کے ٹھوس اور بے لطف حقائق سے ہر رومانی آرٹسٹ ایک شدید انفرادیت کے جذبہ کا حامل ہوتا ہے۔ اور اسی لئے اس کا اپنی ذات اور ذاتی کیفیات اور احساسات میں مستغرق ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ باقی رہا مریضانہ ذہنیت کا طعنہ سو میں کہوں گا۔ کہ یہی مریضانہ ذہنیت کا نتیجہ ابوالکلام جیسے اہلِ قلم کی صورت میں ظاہر ہو۔ وہ دنیا کے لئے

کچھ ایسی ناقابلِ قبول نہیں ہونی چاہیئے۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ مولانا اپنی ذہنی اور روحانی ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے ایک خاص نقطہ پر پہونچے۔ اور اسے پسند کرکے وہیں مقام فرمایا۔ اس سے آگے بڑھنے کی شاید انکو ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ سالک ہونے کی بجائے مجذوب ہیں۔ مگر ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ کہ اگر سالک کا مرتبہ بلند ہے۔ تو مجذوب کا مرتبہ بھی کچھ کم نہیں۔

(۵) اپنے حالات و کوائف کے علاوہ جن میں چائے کا مضمون اور چڑوں چڑیوں کی حکایات وغیرہ سب شامل ہیں۔ مولانا نے "غبارِ خاطر" میں فلسفیانہ مسائل بھی چھیڑے ہیں۔ اور ایک مکتوب مورخہ ۵ر دسمبر ۱۹۴۲ء میں پانچویں صلیبی حملے کے واقعات کے متعلق تاریخی بحث بھی کی ہے۔ ان نگارشات کے متعلق معترضین یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ فلسفیانہ بحثیں مولانا کے اپنے افکار کا آئینہ نہیں ہیں۔ بلکہ اُنھوں نے مختلف لوگوں کے خیالات کو محض اپنے اندازِ تحریر کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ مختلف قسم کے خیالات "غبارِ خاطر" میں محض سطحی طور پر نمایاں ہوئے ہیں۔ اور جن سائنسدانوں یا فلسفیوں کا نام بحث کے دوران میں لیا گیا ہے ان کی تحقیقات یا خیالات پورے طور سے بیان نہیں ہوئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو ان لوگوں کی تصنیفات کے متعلق سرسری سے زیادہ واقفیت نہیں۔ مگر وہ اس واقفیت کی نمائش کے خواہاں ضرور ہیں۔ معترضین اپنے اعتراض کے ثبوت میں متعدد مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ۷ ار اکتوبر ۱۹۴۲ء کے مکتوب میں مولانا نے انسٹائن کا ایک قول نقل کیا ہے۔ جس میں سائنس کی جستجوئے حقیقت کی سرگرمیوں کو شرلاک ہومز کی سراغ رسانیوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے اس کتاب کا نام "دی ایوولیوشن آف فزکس" لیا ہے۔ جس میں یہ قول درج ہے۔ اور یہ تصریح بھی فرمائی ہے۔ کہ اس کتاب کی ترتیب میں لیوپولڈ انفیلڈ بھی شریک تھا۔ معترضین کا کہنا ہے کہ یہاں انسٹائن کا نام لئے بغیر بھی یہ قول (جس کا مضمون انسٹائن کے علاوہ اور لوگ بھی دہرا چکے ہیں۔ اور جو انسٹائن سے خاص نہیں ہے۔) نقل کیا جاسکتا تھا۔ پھر اس کتاب کا نام لینا اور لیوپولڈ انفیلڈ کا ذکر کچھ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور جگہ مولانا لکھتے ہیں۔ "ابھی چند دنوں کی بات ہے۔ کہ پروفیسر جوڈ کا ایک مقالہ میری نظر سے گذرا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ ان تمام فیصلوں پر جو ہم نے مذہب اور خدا کے بارے میں کئے تھے اب از سرِ نو غور کرنا چاہیئے۔ یہ پروفیسر جوڈ بعد از جنگ کا اعلان ہے۔ لیکن پروفیسر جوڈ قبل از جنگ کے اعلانات کس درجہ اس سے مختلف تھے، برٹرنڈ رسل نے بھی گزشتہ سال ایک مطول مقالہ میں جو بعض امریکی رسائل میں شائع ہوا تھا ایسی ہی رائے ظاہر کی تھی۔" اس عبارت کو پڑھنے کے بعد پروفیسر جوڈ یا برٹرنڈ رسل کے فلسفوں پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام محض اس لئے عبارت میں داخل کئے گئے ہیں۔ کہ پڑھنے والے لکھنے والے کے تبحر علمی سے متاثر ہوں۔ معترضین اس قسم کی مثالیں اور بھی پیش کرتے ہیں۔ پانچویں صلیبی حملے والے تاریخی مضمون کے متعلق یہ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ درجۂ دوم

کے یوروپین مصنفوں کے انداز کی قیاس آرائی ہے۔ اور مولانا نے اس مضمون اور اکثر دوسرے مضمونوں میں یورپ کے عام ادبی مضمون نگاروں کی تقلید کی ہے۔

اس قسم کے اعتراضات کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ انکی بنیاد دراصل کسی ایسے شدید اختلاف پر معلوم ہوتی ہے۔ جو معترضین کو مولانا کی ذات گرامی سے ہے اور جس کو ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں یہی جذبہ ہے۔ جو ان لوگوں کو مولانا کی ادبی تصنیفات کی خوبیاں انصاف سے دیکھنے اور سمجھنے سے روکتی ہے۔

وعین الرضا من کل عیب کلیلۃٌ کما ان عین السخط تبدی المساویا

"غبارِ خاطر" کے فلسفیانہ مکاتیب قلمبند کرنے سے اگر مولانا کو اپنے علم و فضل کی نمائش مقصود ہوتی تو یقیناً بہت سے اور نام اور تذکرے بھی ان کی تحریر میں آسانی سے شامل ہو سکتے تھے جواب نہیں ہیں۔ مثلاً اگر انھوں نے انشٹائن جوڈ۔ رسل۔ لارڈ مارگن وغیرہ کا ذکر نمائش کی خاطر کیا ہے تو کانٹ۔ ہیگل۔ نطشے۔ لا مارک میکس پلانک۔ وغیرہ کا ذکر بھی وہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ باور کرنا تو مشکل ہے کہ مولانا کو ان فلسفیوں اور سائنسدانوں یا ایسے ہی اور لوگوں کے ناموں سے واقفیت ہی نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا کے فلسفیانہ مضامین میں بعض بحثوں کی طرف سے صرف اشارہ کیا گیا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا کو معلوم ہوتا۔ کہ یہ اختصار معترضین کو کھٹکے گا۔ تو وہ ضرور تفصیل سے کام لیتے۔ رہی یہ بات کہ مولانا پر یوروپین مصنفین کا اثر ہے۔ تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے ان کے کمال پر کوئی حرف آ سکے۔

کیں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

مولانا علم و فضل کا بہتا ہوا دریا ہیں۔ بہتے دریا میں تنکے بھی ہوتے ہیں۔ اور موتی بھی۔ وہ سطحی لوگ جنہیں تنکوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تنکے چننے میں مصروف رہتے ہیں۔ اور جو موتیوں کو پرکھنے والے ہیں وہ موتی نکال لاتے ہیں۔

(۱۶) آخر میں مجھے کتاب کے سوانحی پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ باوجودیکہ "غبارِ خاطر" میں مولانا کے اپنے اور اپنے خاندان کے حالات کا جابجا ذکر ہے۔ انھوں نے یہ حالات وضاحت اور تسلسل کے ساتھ بیان نہیں فرمائے "تذکرے" کے ابتدائی حصے میں اپنے آبائی حالات کی طرف چند اشارے ہیں۔ "غبارِ خاطر" میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مجھے بعض احباب کے ذریعے سے جن میں مولانا کے عقیدت مند بھی شامل ہیں۔ مولانا کے خاندان کے متعلق جو روایتیں پہونچی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کا وطن مالوف پنجاب ہے۔ اور آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق قصبہ کھیم کرن سے ہے۔ جو قصور کے نزدیک واقع ہے۔ میں نے خود کھیم کرن کے چند لوگوں کو اس تعلق پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے سُنا ہے۔ ان روائتوں کو ایک خبر رساں ایجنسی کی رپورٹ سے جو ۵ ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

کو اخباروں میں بھی تقویت ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب مولانا لاہور کے فلیٹی ہوٹل میں مقیم تھے رپورٹ میں کہا گیا تھا۔ کہ کیمبل پور کے رہنے والے ایک سن رسیدہ بزرگ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آدھ گھنٹہ تک ان سے بچپن کے زمانے کی جو اُنھوں نے مولانا کے ساتھ گزارا تھا۔ باتیں کرتے رہے۔ خود مولانا نے تذکرے میں لکھا ہے۔ کہ ان کے دادا مولانا محمد بارکی دہلی مرحوم کے ایک مشہور خاندان مشائخ سے تعلق رکھتے تھے۔ بظاہر "تذکرے" کے اس بیان اور ان مذکورہ روایات میں جو مجھے بعض معتبر ذرائع سے پہونچی ہیں ایک تضاد اور تخالف پایا جاتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ کہ جونہی مولانا اس مسئلے کی وضاحت فرمادیں گے۔ معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور کوئی تناقض باقی نہیں رہے گا۔

ایک پہیلی

جرمنی میں موٹر سازی کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا جس کا نام Bayerische Motorenwerke تھا۔ جنگ کے دوران میں اس کا بہت سا حصہ تباہ ہو گیا۔ لیکن جو کچھ باقی بچا وہ بھی بہت تھا۔ غالباً تاوان جنگ کے سلسلہ میں یہ فیصلہ ہوا کہ اس کارخانہ کا ۹۵% حصہ، ہندوستان کو دیدیا جائے۔ اس کے متعلق نیویارک کے اخبار (Time) بابت یکم نومبر ۱۹۴۸ء میں، اس کارخانہ کے منیجر (Kurt Donath) کی زبانی حسب ذیل واقعہ شائع ہوا ہے۔

> "یہ سامان ہندوستان کے لئے مختص کر دیا گیا تھا کہ اتنے میں ہندوستان کی تقسیم ہو گئی۔ غالباً ان تقسیم شدہ ملکوں کے باہمی تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ ان میں سے ایک ملک کا نمائندہ آیا اور اپنی حسب پسند اچھی اچھی مشینیں اٹھوا کر لے گیا۔ دوسرے ملک کا نمائندہ اس کے بعد پہنچا بچے کھچے سامان پر نگاہ ڈالی اور منہ پھیر کر چلدیا۔"

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو بتائیے! کس ملک کا نمائندہ بعد میں پہنچا ہوگا۔

کیا حکومت پاکستان اس واقعہ پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہے۔؟

خود حریم کعبہ میں!

ہندوستان ٹائمز بابت ۵ نومبر ۱۹۴۸ء میں ذیل کی خبر شائع ہوئی ہے۔

"حج کے ایام میں مسلمانان عالم کی ایک کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ لیکن ہندوستانی قونصل متعینہ جدہ کی مداخلت سے یہ کوشش ناکام رہی۔

پاکستانی علماء چاہتے تھے کہ وہاں ایک مؤتمر اسلامی منعقد کی جائے جس میں مسئلۂ کشمیر اور حکومت ہند کے خلاف مسلمانوں کی دیگر شکایات پر بحث وتمحیص ہو سکے۔ پروفیسر عبدالمجید خان۔ ہندوستانی قونصل کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے سعودی حکومت سے کہا کہ اگر انہوں نے اس قسم کی مؤتمر کے انعقاد کی اجازت دی تو یہ ضروری ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندے، ان کی آبادی کے تناسب سے۔ اس میں بلائے جائیں۔ یا پاکستانی علماء کے مقابلہ میں ہندوستانی علماء کو بھی اس قسم کے مؤتمر منعقد کرنے کی اجازت دی جائے۔

سعودی حکومت نے ان دلائل کی وقعت کو محسوس کیا اور مجوزہ مؤتمر منعقد نہ ہونے دی۔ باایں ہمہ پاکستانی علماء نے ہندوستان کے خلاف اپنا پروپیگنڈا جاری رکھا اور وہ ہندوستانی حکومت کے مزعومہ مظالم اور تشدد کی کہانیاں بیان کرتے رہے لیکن ہندوستانی حجاج نے اپنے تجربات بیان کر کے اُن کے غلط اثر کو زائل کر دیا۔

عرب کے عوام، پاکستان کے ایجنٹوں کے پروپیگنڈا سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ ان کے فریب میں نہیں آتا۔ معلوم ہوا ہے کہ سلطان ابن سعود خود بہت باخبر انسان ہیں، اور ان معاملات کو مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں جانچتے۔ لیکن ان کی حکومت کے تمام افسروں کے متعلق ایسا نہیں کہا جا سکتا۔

پاکستان کے پروپیگنڈے کے ابطال کے لئے ہندوستان کو اپنے پروپیگنڈے کی مہم کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے یہ صورت حال اطمینان بخش ہے کہ حکومت ہند کے نمائندہ کی موجودگی سے دنیائے اسلام کے حجاج کو حکومت ہند کے متعلق صحیح صحیح باتیں معلوم ہو گئیں۔"

آپ نے غور فرمایا کہ ہندوؤں کے نشتر کی زد کہاں تک پہنچ رہی ہے؟ کیا حکومت پاکستان صحیح صورت حالات پر روشنی ڈالیگی؟ یا کوئی اور صاحب، جو حج سے واپس آئے ہوں، براہ کرم ہمیں مطلع فرمائیں گے کہ وہاں اس باب میں کیا صورت پیش آئی تھی؟ یہ معاملہ بڑا اہم ہے۔

خوشامدانہ اور رجعت پسند ذہنیت سے تھا۔ اسلامی افکار و سیاسیات سے ناآشنا ترک نوجوان غلطی سے اسے ہی اصل "قانونِ شریعت" اور "اسلامی نظام" سمجھے بیٹھے تھے ظاہر ہے کہ ایسے قانونِ شریعت اور مذہبی نظام میں جو صدیوں سے اپنی فعالیت اور تاثیر و حرکت کی ٹھوس مثال پیش نہیں کر سکا تھا ان کے لئے کوئی جاذبیت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس تلخ حقیقت کی بنا پر وہ اس قسم کا کوئی مزید تجربہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بدقسمتی سے ان میں کوئی ایسا شخص بھی موجود نہ تھا جو علمی نظر و فکر کا حامل ہوتے ہوئے قرآن کے پیش کردہ اصول و قواعد کو الہامی یا وجدانی رنگ میں قوتِ اجتہاد و استنباط سے شرح و بسط کے ساتھ ترتیب دیکر جدید ترکی اور وقتی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے خلفاءِ و فقہاء کے عمل اور اسلام کے تہذیبی نظام کا فرق نمایاں کر دکھاتا۔

ترک نوجوانوں کے لئے یہ ایک نازک ترین مرحلہ تھا۔ ایک طرف مغربی مادیت بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح ہر خشک و تر کو اپنے بہاؤ کی لپیٹ میں لے رہی تھی دوسری طرف اسلامی تہذیب اپنے اصل مرکز سے دور ہٹ کر جذب و کشش کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکی تھی۔ مسلسل اور طویل دفاعی کشمکش سے تھکے ماندے ترک جو ہیئت اسلامی میں اجتہاد کی افادیت و اہمیت سے ناآشنا تھے اپنے زوال پذیر نظام کے پیشِ نظر یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ زمانے کے جدید اقتضایات کے مطابق ترقی صرف مغربی تہذیب کو اپنا لینے میں مضمر ہے۔ وہ تمام علمی اور سائنسی انکشافات کو مخصوص مغربی طرزِ فکر و عمل کا اجارہ سمجھنے لگے انھوں نے دین کو مذہب لہٰذا چند رسمی عقائد تک محدود خیال کرتے ہوئے خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ معاملہ قرار دے دیا اور ملکی و سیاسی امور میں ان کے دماغ نے وہی راستہ اختیار کیا جس پر اہلِ مغرب جا رہے تھے۔ بقول اقبالؒ "ترک قوم پرستوں نے دین و دنیا کے جدا جدا ہونے کا خیال یورپ کی تاریخ افکار سیاسی سے جذب و اخذ کیا ہے۔" فرنگی دماغ سیاست کے جس مادی تصور کو اپنا رہے تھے قلبی اور ذہنی طور پر بھی وہ اس سے ہم آہنگ تھے، کیونکہ عیسائیت جو ایک خانقہی سلسلے کی شکل میں نمودار ہوئی تھی مختلف تحریکوں سے لے کر وحدتِ انسانی کے ایک تہذیبی نظام کی شکل میں چلانے کی تمام کوششیں ناکام رہ چکی تھیں لہٰذا دنیائے مسیحیت مذہب اور سیاست کے جداگانہ نظریہ کی اختراع پر مجبور تھی۔

اس کے برعکس اگرچہ جدید ترکی سابقہ مستعمل نظام سے پیدا شدہ انقلابی بحران کے ہنگامہ خیز لمحات میں اپنے لئے ایک سمت کا تعین کرتے ہوئے دین و دنیا کے جداگانہ تصور کو عملاً قبول کر چکا تھا۔ لیکن ذہنی طور پر وہ اسلام کو Ideal اور اصولی حیثیت سے ایک دستورِ حیات ماننے سے انکار بھی نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ مغرب کی تقلید کے ساتھ ساتھ مذہب کے بنیادی حقایق پر غور و خوض کا سلسلہ بھی جاری رہا اور مغرب زدہ دماغی افکار و آراء سے سعید حلیم پاشا کی مجلس اصلاحِ مذہب کی آواز بھی ٹکراتی رہی۔ اسی جدید و قدیم کی ذہنی کشمکش میں گرفتار رہ کر ترکی نہ تو مغرب کی پوری تقلید کر کے مادی لحاظ سے ایک بہترین طاقت بن سکا اور نہ پورے طور پر اسلامی اصول و افکار کو جذب کر کے اپنے معاشرے کو دنیائے اسلام کے لئے قابلِ تقلید ہی بنا سکا۔ ایران پر علماء کی شدید گرفت اس کے سیاسی جمود کی ذمہ دار رہی ہے۔ مذہبی طور پر اجتہاد کے عملی امکانات کے باوجود وہ اس کی افادیت سے محروم رہے جس کا نتیجہ گاہ گاہ مغربیت اور مشرقیت کے انتہاپسندانہ تاثر کی شکل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

نظامِ شریعت

ان تجربات کی روشنی میں ہم یہ اصول مرتب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ انقلابی دور سے گذرنے والی ایک مسلم قوم معاشرتی و تمدنی نظم و نسق کے لئے ایک ایسے تہذیبی نظام کی محتاج ہے جس کی بنیاد تصوریت (Idealism) اور ایجابیت (Realism) کی ہم آہنگی اور ذہنی و خارجی تطابق پر ہو اور اس اعلان میں ہم بجا طور پر یہ فخر کر سکتے ہیں کہ وہ صرف اسلامی "نظامِ شریعت" ہی ہے۔

موجودہ دور میں جبکہ دنیائے اسلام اپنی نشاۃ الثانیہ کے لئے انگڑائی لے رہی ہے اور مسلمانوں کے لئے غلامی کی پستیوں سے ابھرنے کے امکانات روشن ہو رہے ہیں ضروری ہے کہ قانونِ اسلام کی فقید المثال ارتقائی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر اس نشاۃ کو ترکی و ایران کی نشاۃ سے ممتاز اور زیادہ موثر بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم امر "اسلامی نظام" اور "قانونِ شریعت" کے مفہوم و معانی کی وضاحت ہے جن کے روشن پہلو ہمارے فقہی مذاہب کے فرسودہ دفتروں کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔

اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے اور خدا کے مابین تخلیہ کر کے خالص اور

وضع و ترتیب ہوئی ہے۔ اس کے لئے سب سے مقدم ایسی انسانی شخصیتوں کی پرورش و افزائش ہے جو صرف شکل و صورت کی نہیں بلکہ دل و دماغ کی مسلمان ہوں، اور جو انسانیت کے قدرِ مشترک کا احساس و ادراک اس رنگ میں کریں کہ نسلِ انسانی کا ہر فرد اس بین الاقوامی عقدہ کا حل بن جائے جو منافی وحدت انسانیت ہے۔ ایسی اسٹیٹ سے مراد وہ اسٹیٹ ہے کہ جس میں نسل، قوم، وطن اور مذہب کے پست اور جاہلی تخیلات کی سطح سے اٹھا کر انسان کو ایک بلند مقام آزادی پر لیجایا جائے اور جہاں تعلیم و تربیت کا ایک صحیح اور فطری معیار قائم کیا جائے جس کی تکمیل سے آفاق و انفس کے اسرار کے وہ مخفی باب کھلیں جن سے انسان فطرت کی آخری اور مکمل مخلوق ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آخری اور مکمل محرمِ راز بھی بن جائے۔

یہی ہے وہ بلند مذاق کہ نفوسِ انسانی میں اس کی کِشت کے لئے ارضِ اسلام کی ضرورت پڑتی ہے۔ صرف نکاح، طلاق، وراثت، یا چند دیگر ظاہری رسوم کے فقہی قواعد کے مطابق انجام پانے سے کوئی اسٹیٹ اسلامی نہیں بن سکتی۔ یا کسی خاص عہد کے "اسلامی طرزِ حکومت یا نظام" کو آج کی اسلامی دنیا کا دستور بنا دینے سے وہ مطالبہ پورا نہیں ہو سکتا جس کی متقاضی اسلامی اسٹیٹ ہے۔ جب تک پیدا شدہ حالات کے صحیح ادراک و احساس کے تحت پورے معاشرے کو اسلامی سانچے میں نہ ڈھالا جائے، اسلامی اسٹیٹ کا قیام ناممکن ہے۔

پاکستان اور اسلامی نظام

دولت پاکستان کے اہلِ حل و عقد کی خاموش پالیسی عامۃ المسلمین کو لب کشائی پر مجبور کر رہی ہے۔ شاید ہمارے اربابِ اقتدار ترک قوم پرستوں کی طرح اسلامی اصولوں کی ارتقائی حیثیتوں سے ناآشنا ہیں اور اسی مایوسی کے تحت آئینِ اسلام کے نفاذ سے جھجک محسوس کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع ایسا ہے تو انھیں اس واہمہ سے آزاد ہو جانا چاہیے۔ ترک کی مثال قابلِ عمل نہیں۔ اس وقت اور آج میں ہر لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کو بالخصوص دوسروں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس ماحول میں کسی مغربی جمہوری طرز کا قبول کر لینا اس سوسائٹی کی فطری اور حرکی صفات کو بروئے کار آنے سے روک دینے کے

مترادف ہے اور ان شخصی قوتوں اور قابلیتوں کے اُبھار کو دبا دینا ہے جن سے پاکستان کی قدر و قیمت اور اہمیت وابستہ ہے۔ کسی غیر اسلامی طرزِ حکومت کی صورت میں یہاں کے مخصوص اسلامی اور مذہبی جذبات کا مطالبۂ پاکستان، کو کشمکش مشرق و مغرب کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑا کر دے گا جس سے کسی ایک سمت کا تعین ناممکن ہو جائے گا۔ اس لئے وقت کی نزاکت کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ایک اسلامی ریاست کو معرضِ وجود میں لانے کی فوری ضرورت ہے جس سے دنیائے اسلام میں ذہنی و خارجی ہم آہنگی پیدا ہو کر مرکز کے تحفظ و بقاء کا احساس پیدا ہو جائے۔

انسانی حقوق و فرائض

شرعی قوانین کے تفصیلی اجرا و نفاذ کی افادیت میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں فطرت کا صرف یہی پروگرام ہے کہ مقررہ حدود سے انسانیت کے مجموعی حقوق کی حفاظت سختی سے کی جائے۔ قاتل کے لئے قصاص، زانی کے لئے جلد، اور سارق کے لئے قطع ید کا حکم دے کر خدا نے اپنی آمرانہ حیثیت کو منوانا نہیں چاہا بلکہ جماعتی تنظیم اور انسانی حقوق کی قدر و قیمت کو واضح کیا ہے۔ وہ ان معاملات کے متعلق عفو و مغفرت کا اعلانِ عام کرتا ہے جو اس کی ذات اور فرد کے مابین خاص ہیں لیکن ان جرائم و واردات کی سزا دہی سے کبھی اغماض نہیں برتتا جن سے جماعت کی عادلانہ تنظیم اور حقوق و فرائض کی مساویانہ تقسیم میں رخنہ اندازی ہوتی ہو

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اسلام کی تعلیم کے مطابق سب سے زیادہ صالح بنی نوع انسان کا، جو قانونِ الٰہی کی غرض و غایت کو سمجھتے ہوئے انسانی حقوق کی سب سے زیادہ نگرانی کرنے والا ہے۔ المسلم من سلم المسلمون عن یدہ ولسانہ لہٰذا سیاساتِ حاضرہ کی غیر اخلاقی روش سے حیاتِ انسانی کی قدر و قیمت کو جو خسارہ اٹھانا پڑا ہے اس کے تدارک اور حقوق و فرائض کی صحیح نگہداشت کے لئے ایک ایسے محکمہ یا معاشرہ کا قیام لازمی ہے جو اصلاحی اور اصولی حیثیت سے عالمگیر ہو اور عملی و مثالی حیثیت سے اسلامی اسٹیٹ۔

اضافی نظامات

عہدِ حاضر کی کسی نوزائیدہ اسلامی ریاست میں "قانونِ شریعت" کے اجرا و نفاذ کے لئے ہمیں اسلام کے اُن ابدی اور دائمی اصولوں کی روشنی میں جو زمان و

مکان کی قیود سے آزاد ارتقاء و حرکت کی صلاحیت رکھتے ہیں، قوانین مرتب کرنے پڑیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت واضح ہو جانی چاہیئے کہ "قانونِ شریعت" یا "آئینِ اسلام" سے مراد شیعی سُنی فقہ اور طریقِ اجتہاد کے وہ ذخیرے نہیں جو آج سے صدیوں پہلے کتابی صورت میں مدون ہو چکے ہیں۔ یہ تمام انفرادی تشریحات ہیں اور جزوی واقعات کا سلسلہ جو محل و موقع کی نزاکت سے وجود میں آکر فنا ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے وہ اصولی بقا نہیں ہوتی جس میں رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ حرکت کی صلاحیت موجود ہو۔ ورنہ یہ کہنا مشکل ہو جائے گا کہ "قانونِ اسلام" ارتقاء پذیر ہے۔ خلفاءِ راشدین کا "طرزِ عمل" جسے تاریخی زبان میں سیرت سے تعبیر کیا جاتا ہے اُن کے مخصوص عہدِ حکومت میں "آئینِ شریعت" تھا۔ ایسے ہی مجتہدین کے کتابی صورت میں جمع شدہ "فتاویٰ و احکام" ماضی کی کسی "اسلامی حکومت" کا شرعی نظام کہلا سکتے ہیں۔ اس قسم کے اضافی نظامات زمان و مکان سے وابستہ ہیں اور ازمنہ و امکنہ کے اختلاف سے ان میں اختلاف پایا جانا ضروری ہے۔ بحیثیت ضابطہ کلیہ یہ اصول "قانونِ شریعت" نہیں بلکہ اصل کی فروعات میں سے ہیں۔ ارتقاء و حرکت کی صلاحیت ان افراد میں نہیں بلکہ اُن کل اور ابدی اصولوں میں ہے جو نفسیاتی حیثیت سے اپنی ان تمام فروعات پر محیط ہیں کیونکہ اسلام کے بنیادی حقائق و نظریات کسی خاص دور کی تشریح میں محصور نہیں کہ اس تشریح کو قطعی سمجھ کر بحیثیت اصل کے لے لیا جائے۔ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ بہت ممکن ہے اس قسم کی ہزاروں انفرادی تشریحیں وجود میں آجائیں کہ قدرت جن سے اسلام کی ابدی اصولی اہمیت کو واضح کرنا چاہتی ہو اور یہ ثابت کر دکھانا چاہتی ہو کہ قانونِ اسلام ارتقاء پذیر ہے۔

اصولِ فطرت اور فقہی تشریح

اسلامی اصول اور طرزِ فکر کی روشنی میں ایک خاص زمانہ کی فقہی یا قانونی تشریح فطرت کے اس منشاء کی تفسیر ہے جو اس دور کے لئے خاص ہے۔ ایک صدی یا ہزار صدی گذر جانے پر فطرت ان ہی اصولوں کی تشریح ایک ایسے نئے انداز میں کروانا چاہتی ہے جو اس دور سے متعلق منشاء کی تفسیر ہو۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ فطرت کا تعلق کائنات اور افراد اقوام ازمنہ یعنی اجزائے کائنات سے ہے۔

ایک برہانی دلیل ہے۔ آج کتابی شکل میں احادیث کے دفتر اسی لئے نہیں کہ انھیں ازلی وابدی حیثیت میں قیامت تک کے حالات و واقعات کے لئے ایک مستقل وظیفۂ حیات سمجھ لیا جائے۔ یہ مطالبہ حدیث کے موضوع اور مقام سے زائد ہوگا کیونکہ احادیث میں احکام معاملات کی تفصیل اسی قدر ہے۔ جس قدر واقعات پیش آتے رہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک خاص سوسائٹی کے مخصوص اوضاع و اطوار کے حسب تقاضا ایک محدود ضابطۂ حیات ہے جبکی تفصیلی افادیت کا خصوصی مرجع بھی وہی سوسائٹی ہے۔

زمانۂ رسالت سے عہدِ صحابہ یا اس سے کم وبیش ایک متصل اور مربوط دور تک عام معاملات میں تمسک بالاحادیث سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہوسکتا کہ سینکڑوں تغیرات و انقلابات کے باوجود مختلف ازمنہ میں ان آثار پر حرف بحرف عمل پیرا ہونا ضروری ہے جب کہ خود دنیائے اسلام کائنات کے حیرت انگیز ارتقا سے اثر پذیر ہوکر اپنی بقا کے لئے نئی راہوں کی تلاش میں گامزن ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک عمومی لحاظ سے ملہمانہ تعلیم کا اسلوب یہ ہے کہ "کسی رسول پر نازل شدہ شریعت میں اُن لوگوں کے عادات و اطوار اور خصوصیات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے جن کی طرف وہ مخصوصاً مامور کیا گیا ہو لیکن وہ پیغمبر جس کا مطمح نظر ہمہ گیر اصول ہوں نہ تو مختلف اقوام کے لئے مختلف احکام دے سکتا ہے اور نہ انھیں اپنی وضع و روش کے اصول وضع کرنے کی کھلی چھٹی دے سکتا ہے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ ایک خاص قوم کو تربیت دے اور پھر عالمگیر شریعت کی بنا و تشکیل میں اسے مرکز کے طور پر استعمال کرے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ساری نسل انسانی کی معاشری زندگی کی تہ میں جو اصول کارفرما ہیں اُن پہ زور دیتا ہے۔ اور اُن کا اطلاق پیش نظر قوم کی مخصوص عادات کی روشنی میں مخصوص واقعات پر کرتا ہے۔ اس اطلاق سے پیدا شدہ شرعی احکام ایک لحاظ سے خاص اُسی قوم سے متعلق ہوتے ہیں اور چونکہ اُنکی تعمیل و پابندی بجائے خود ایک مقصد نہیں ہے اس لئے آنے والی نسلوں پر سختی کے ساتھ اس کا نفاذ نہیں ہوسکتا۔"

ہماری یہ تنقید "حدیث" کے تفصیلی پہلو پر ہے لیکن "علم حدیث" ایک ایسے لٹریچر کی حیثیت میں جو مشکوٰۃ نبوۃ کے انوار و برکات اور زبانِ رسالت کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ اس علمی و اجمالی لحاظ سے بیشک نوعِ انسانی کے لئے ایک مستقل ضابطۂ حیات ہے اور عالمگیر شریعت کی تشکیل میں قرآنی تعلیم کا عملی طریقہ تعارف۔

اختلاف روایات کی بنا پر "فرقات و مذاہب" کی پرورش "جزیات حدیث" سے ہمارے اسی قطعیت پرستانہ طرز عمل کا نتیجہ ہے۔ اس قسم کا اختلاف ایک طبعی امر ہے جو زمان و مکان اور فرد و جماعت کے اضافی اور وقتی مصالح کی رعایت پر مبنی ہے۔ حدیث کا آزادمطالعہ ہمیں اُس ذہنی الجھن سے نجات بخشتا ہے جو ان مختلف احادیث کے عملی راستہ میں پیش آتی ہے' وہ متضاد المعنی روایات جو صحت اسناد کے معیار پر

پورا اترنے کے باوجود علماء پر گراں گزرتی ہیں اور ہمیشہ تنقیدی سرگرمیوں کے جال میں رہتی ہیں کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ مختلف ادوار کے مختلف نشیب و فراز سے مطابقت رکھتی ہوں اور ان کے اختلاف کا وہی مطلب ہو جسے رسول اللہ نے اختلاف امتی رحمۃ کے مختصر ارشاد میں بیان فرما دیا ہے؟ میری زبان سے آپ یہ حقیقت تسلیم نہیں کرنا چاہتے تو فقہاء اور خصوصاً ائمہ اربعہ کے مختلف اور متضاد مسالک کے خدوخال کا بغور مطالعہ کیجئے جن پر صدہا سال سے آج تک عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اسلام کی عالمگیر سیرت کے دائرہ عمل میں وحدتِ انسانی کی بین الاقوامی تشکیل کا تصور اس نشائے اختلاف کی اور بھی وضاحت کرتا ہے جہاں معنوی اتحاد اور اصولی یگانگت کے احترام میں "اشتراکِ عمل" کو ایک موثر قوۃ بنانے کے لئے متعدد رسمی اور فروعی خصوصیات کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں قوتِ برداشت پیدا ہو جائے اور ہم اپنے دلوں میں ایک دوسرے کا مقام تسلیم کرلیں تو معمولی اختلاف جو رائی کا پہاڑ بن چکا ہے ایک متنوع قانون کی صورت میں ہماری تنگ ظرفی کا موثر علاج بن سکتا ہے۔ اور اسلامی قدروں کی اشاعت متعدد راہ ہائے عمل کے ذریعہ زیادہ سہولت اور آسانی سے انجام پذیر ہوسکتی ہے۔ اس مختصر تبصرہ سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ قرآن و حدیث اجمالاً و تفصیلاً ہر دو حیثیتوں سے کسی اصطلاحی مذہب یا ادارہ کا دستور العمل نہیں ان کی تعلیم کا نصب العین نسلِ انسانی کو خونی اور زمینی رشتوں کے محدود تصورات سے بلند تر ایک نفسیاتی رشتہ میں منسلک کرنا ہے جس سے کمتر کوئی مقام وحدتِ انسانی کے عظیم الشان تعمیری سلسلہ میں کفایت نہیں کرسکتا۔

شخصی اور اجتماعی اعمال اس وقت تک محض ذاتی یا سیاسی اغراض ہیں۔ جب تک ان کا منبع اور سرچشمہ فوق المادیات ایک روحانی حقیقت نہ ہو۔ یہ ادراک انسانی احساسات میں ایمانی حقیقتوں کے ایک عارفانہ مذاق کو بیدار کرتا ہے جسکی روشنی میں اعمال و افکار کی تگ و دو خون و زمین کی سطحی دیواروں کو پھاند کر زندگی کے نفسیاتی حقائق سے ہمکنار ہوتی ہے اور ناقابلِ حل بین الاقوامی تصور کا وہ پیچیدہ اور مشکل مسئلہ صرف اتنا سمجھ لینے سے حل ہو جاتا ہے کہ نسلی، قبائلی اور وطنی حد بندیوں کی منافرت فقط اسی صورت میں باقی رہتی ہے جب اپنی زندگی کی آخری اساس سمجھ کر ان کے اہم روحانی اساس سے اعراض کیا جائے۔ یہی ہے اسلام کا وہ بلند نصب العین۔ نظریۂ "توحید" جس میں وحدتِ عالم کا راز مضمر ہے۔ ہم اسلامی اسٹیٹ کا وجود اصطلاحی نہیں بلکہ عالمِ انسانیت میں قرآنی تعلیم کی عمل پذیرائی کا طبعی نتیجہ مانتے ہیں جو ایک معاشرے یا تمدن کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ "قانون و آئین" کی کوئی خاص شکل مقصود بالذات نہیں۔ اسلامی سیاسیات میں ہر وہ پروگرام قابلِ احترام ہے۔ جو نوعِ انسانی کی ذہنی اور خارجی زندگی میں "اصول حیات" کو ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی ذریعہ ہو۔ کائنات کے مجموعی ارتقاء اور عقلِ انسانی کی حیرت انگیز ترقیوں کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت اور معقولیت برقرار رکھنے کے لئے اس "حکمتِ عملی" میں اتفاقی تبدیلیاں ہوتی

رہیں گی۔ کسی ایک عہد کا تشریحی نظام اپنی جامعیت کے لحاظ سے کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو۔ بہرحال ایک اضافی اور انفرادی مجموعہ ہی ہے جس کے متعلق کسی قسم کی قطعیت کا دعویٰ درست نہیں۔ لہٰذا زمان و مکان کے مختلف النوع اقتضاءات اور ہنگامی حالات و واقعات پر قابو پانے کے لئے ایک متحرک اور جامع اصول کا ہونا لازمی ہے جو شریعت اسلام کے اصول و مبادیات کی ارتقائی تحت الشعوری صلاحیتوں کو فعلیت اور شعور میں لانے کا واسطہ بنے۔ ازمنہ و امکنہ کے بدلنے سے حالات کا بدلنا تمدن و معاشرت کے وسیع ہو جانے سے معاملات کا وسعت طلب ہونا۔ اقتصادی معاشی اور صنعتی امور کا متنوع اور تجدید پذیر رہنا، نئی قوتوں اور ضرورتوں کے صحیح ادراک و اہتمام کے لئے ماضی کے خیالات و تجربات کا کافی ہونا، ریاستی وظائف کا تقرر اور تحفظ و بقا کے ذرائع ایسے ہی سینکڑوں امور جن کی کیفیت اور کمیت کائنات کے ارتقاء سے وابستہ ہے اور کسی ایک زمانہ کے مجتہد یا فلاسفر کے لئے ان مجہول الحال غیر متناہی جزئیات کا احاطہ کر لینا عقلاً محال ہے۔ ضروری ہے کہ دنیائے اسلام کے پاس ایک ایسا میزان ہو جس پر حادثات و واقعات کے علل کا صحیح اندازہ لگا کر ہر حادث فرع کو شرعی اصل کے تحت منضبط کر دیا جائے "حقیقت اسلامی" میں اسی اعتدال اور حرکی اصول کا نام "اجتہاد" ہے۔ اسی لفظ کے لغوی معنی سعی و کوشش کا التزام کر لینا اور شرعی اصطلاح میں ہر واقعہ و حادثہ کے لئے تعین احکام میں بقدر طاقت منشائے شارع کی تلاش، اس خیال کا سرچشمہ قرآن و حدیث اور صحابۂ رسول کے اقوال ہیں۔

(۱) قرآن " والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم اُن پر اپنی راہیں واضح کر دیتے ہیں) (۲) حدیث "رسول اللہ نے حضرت معاذؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجتے ہوئے ان سے دریافت فرمایا کہ معاملات کا فیصلہ کس طرح کیا کرو گے؟ کتاب اللہ کے مطابق کیا کروں گا، معاذؓ نے جواب دیا۔ اگر کتاب اللہ میں ان معاملات کے لئے صاف حکم موجود نہ ہو"؟ اسوۂ رسول کو اپنا رہبر بناؤں گا۔" "اگر اسوۂ رسول میں بھی اسی طرح تمہاری رہبری کا سامان موجود نہ ہو"؟ تو پھر میں اپنی عقل و فکر سے اجتہاد کروں گا۔"

(۳) قول صحابہ" حضرت عمرؓ کا مشہور قول "حسبنا کتاب اللہ" نیز حضرت علیؓ عبداللہ ابن عباسؓ عبداللہ ابن مسعودؓ معاذ وغیرہم صحابہ کا عملی اجتہاد۔

ان آثار و شواہد کی موجودگی میں اسلامی روح کے خلاف علمائے اسلام کے "فقہی مذاہب" کی انفرادی تشریحات سے "قطعیت پرستانہ طرز عمل پر جس قدر اظہار تاسف کیا جائے کم ہے۔ اس اس دلدل سے نکلنے کے لئے اب صرف ایک ہی راستہ ہے کہ قرآن کی اصل تعلیمات اور اصولوں کی

تہ میں پھر سے غوّاصی کی جائے۔ اسلامی حقائق، نظریات اور اسلامی اسٹیٹ کو فطری اصولوں کا ایک واقعی مظہر بنانے میں وہ نئی راہیں اختیار کی جائیں جو اعلائے کلمۃ الحق میں اس دور سے متعلق ملتا ہے فطرت کو آشکارا کریں۔

اس سلسلہ میں عصر جدید کے آزاد خیال مسلمانوں کا یہ دعویٰ بالکل جائز اور درست ہے کہ انھیں اپنے تجربات اور زندگی کے بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں فقہ کے بنیادی اصولوں کی تشریح جدید کا حق حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "تاریخ اسلام کا طالب اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ اسلام کی سیاسی ترقی کے ساتھ فقہ کی تدوین و ترتیب ایک اشد ضرورت بن گئی یعنی اور ہمارے ابتدائی عربی اور غیر عربی فقہاء نے انتھک کوششیں کیں حتیٰ کہ فقہی مسائل کے تمام جمع شدہ مواد کی آخری صورت پذیری ہمارے تسلیم شدہ مذاہب کی شکل میں ہوئی۔ یہ فقہی مذاہب (Schools of Law) اجتہاد کے تین درجوں پر یقین رکھتے ہیں۔

(۱) وضع قوانین میں مکمل اجتہاد، یہ عملی طور پر ان فقہی مذاہب کے بانیوں تک محدود ہے

(۲) اضافی اجتہاد، جو کسی خاص فقہی مذہب کی حدود کے اندر ہی برتا جا سکتا ہو۔

(۳) خاص اجتہاد، جس کا تعلق کسی ایسے خصوصی مسئلے کا انطباق ہے جسے بانیانِ مذاہب نے بغیر کسی فیصلے کے چھوڑ دیا ہو۔

یہاں مجھے اجتہاد کے پہلے درجے یعنی مکمل اجتہاد کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اہل سنت اس درجہ اجتہاد کے نظری امکانات کے تو قائل ہیں۔ لیکن جب سے مذاہب فقہ کی ابتداء ہوئی عملی طور پر اسے نہیں مانتے۔ یہ اس لئے کہ مکمل اجتہاد کے گرد جن قیود و شرائط کی حصار بندی کر دی گئی ہے ان کا ایک فرد واحد میں مجتمع ہونا قریب قریب محالات سے ہے۔ قرآن کی بنیادوں پر جو زندگی کے متعلق یقینی طور پر ایک حرکی نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ قائم شدہ نظام قانون کا اس قسم کا انداز و میلان نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس ذہنی طرزِ عمل کی وجوہات دریافت کریں جنھوں نے اسلامی فقہ کو ایک جسدِ بے روح بنا کر رکھ دیا ہے۔" (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ خطبہ ششم) اس جمود کے وجوہات ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تین ہیں۔ تحریکِ عقلیت Rationalism (۲) مرتاضی تصوّف Aesthetic Sufism (۳) حملۂ تاتار اور مسلمانوں کے مرکزِ علمی یعنی بغداد کی تباہی، جن کی تفصیل اعادہ یہاں اختصار کے منافی ہے۔ میرے نزدیک فقہ و اجتہاد کی عدم صلاحیت کی بنیادی وجہ وہ سیاسی فضا معلوم ہوتی ہے۔ جو رسولؐ کی وفات کے بعد ملک میں پیدا ہوئی خلافت

راشدہ کے پہلے دو خلفاء کا زمانہ بیرونی طاقتوں سے لڑنے اور اُن کو شکست دینے میں گذرا اہلِ حل و عقد کی تمام تر توجہ فوجی نظم و نسق پر مرکوز رہی جس سے اسلامی لٹریچر کی مبلغانہ اشاعت کا وہ سلسلہ رُک گیا جو آنحضرتؐ کے عہد میں جاری تھا اور اس کی جگہ اسلامی افواج کی روزمرہ افزوں فتوحات نے لی۔ ایسی فضا میں خالص علمی اور جمہوری اصولوں کی نشو و نما کا معرضِ التوا میں پڑ جانا کوئی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ خلافتِ عثمانی کا آخری اور خلافتِ علوی کا پورا دور اندرونی خلفشار میں گزرا۔ تاہم حضرت علیؓ نے نہایت خوش اسلوبی سے قرآنی تعلیمات اور اسلامی لٹریچر کی نشر و اشاعت پر زور دیا۔ لیکن خود اہلِ اسلام کے باہمی مناقشہ و مخاصمہ کی وجہ سے آپ کی تمام کوششیں مواعظ و مکاتیب کی شکل میں تواریخی دفتروں کا علمی سرمایہ بن کر رہ گئیں۔ اس کے بعد ملوکیت کے غلبہ و اقتدار کا دَور شروع ہوتا ہے۔ جس میں آئینی حدود کی ظاہری شکل تو قریباً وہی رہی لیکن اندرونی رُخ قرآنی نصب العین اور جمہوری تصوّر سے موڑ کر قیصر و کسریٰ کی شہنشاہیت کی طرف کر دیا گیا ہے۔ اس عرصہ میں کسی ایسے ادارہ کا وجود پذیر ہونا ہی محال تھا جو اسلامی اصولوں کی تشریح و تبلیغ کا کفیل ہوتا۔ مسلمانوں کی ان فاتحانہ مصروفیتوں سے جو اثر اسلامی لٹریچر پر پڑا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صاحب اپنے اُس مضمون میں جو انہوں نے ڈاکٹر نکلسن " کے خط کے جواب میں لکھا تھا یوں رقمطراز ہیں "اسلام کو جہاں ستانی اور کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد کے حق میں سخت مضر تھی۔ اس طرح وہ اقتصادی اور جمہوری اصول نشو و نما پا سکے جن کا ذکر قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں جا بجا آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ لیکن ساتھ ہی اُن کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا اور انہوں نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں کہ اسلامی اصولوں کی گہرائی کا دائرہ کس قدر وسیع ہے"۔

دوسری صدی کے آغاز میں مختلف علوم و فنون کی اشاعت کے ساتھ ساتھ "اسلامیات" کے موضوع پر بھی تصنیف و تالیف کا مذاق پیدا ہوا۔ دولتِ عباسیہ کی روز افزوں ترقی اور تمدنی وسعت نے اس وقت کے علماء کو مجبور کر دیا کہ وہ سیاسی ضروریات کے پیشِ نظر فقہی دستور کی تشریح و ترتیب میں ہر ممکن سہولت اور گنجائش کا خیال رکھیں۔ اس سلسلہ میں حماد و زاحی، امام ابوحنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری، ابن مبارک، ابو یوسف، حسن بن زیاد، امام شافعی وغیرہ علماء کی مساعی خاص طور پر نمایاں ہیں۔ اجتہاد و استنباط کا یہ سلسلہ بھی ایک حرکی اصول کی حیثیت سے متعارف و مسلّم نہیں ہوا تھا کہ تیسری صدی کے آغاز میں عقلیت پرستی کا وہ طوفان رونما ہوا جس نے حالات کا رُخ بدل دیا۔ اور فقہ و حدیث کی شرح و تدوین کی جگہ فلسفۂ یونان نے لے لی"۔

خاص خاص مسائل کے علاوہ عقلیت پسند سوسائٹی کے عام رجحان، اور آزاد افکار و خیالات کو مذہبی روایات، پر ایک حملہ سمجھ کر علماء نے معاشرتی نظام کو محفوظ بنانے کے لئے جو طریقہ استعمال کیا وہ آگے چل کر باب اجتہاد کی بندش کا پیش خیمہ ثابت ہوا "قانونِ شریعت" میں مزید شرح و تجدید کی راہ سختی سے بند کر کے فقہی دستور کو امکانی حد تک سخت گیر اور شدید بنا دینے کی سعی کی جس سے اسلامی فلسفۂ عمل کے مدنی و معاشرتی موضوع پر مزید کچھ کہنے کا جواز نہ پا کر تصنیف و تنقید کا اعلیٰ مذاق رکھنے والے قابل افراد مابعد الطبیعاتی مسائل کی نظری الجھنوں میں پڑ گئے، اور اجتہاد و استنباط سے معطل قوتوں پر نظری فلسفہ و تصوف کا رنگ غالب آگیا ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام میں امراضِ تصوف کا وجود ذہین اور متفکر مسلمانوں کی ذہنی کشمکش اور اظہارِ خیال کی ایک اضطراری شکل تھی۔ جسے علماء کے اس قدامت پسندانہ طرزِ عمل کا نتیجہ کہنا چاہیئے جو "تحریکِ عقلیت" کو ضعیف اور غیر موثر بنانے میں اختیار کیا گیا۔ حالانکہ یہ امر خود محلِ نزاع ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے ضعف و انتشار کے اسباب میں زیادہ موثر تحریکِ عقلیت ہو سکتی ہے یا "بندشِ اجتہاد" یہ فیصلہ یہاں مقصود نہیں۔ ہم صرف اتنا بتا دینا چاہتے ہیں کہ "انسانی تاریخ" کا یہ دور نتائج کے لحاظ سے بےحد خطرناک ثابت ہوا۔ رجعت پسند علماء اور عقلیین کی باہمی کشمکش تقلید جامد، اور "امراضِ تصوف" پر منتج ہوئی اور اس طرح رفتہ رفتہ تقریباً پانچویں صدی میں اسلامی فلسفہ کے اقتصادی و معاشرتی پہلوؤں کی تشریح و تحقیق کا وہ باب جسے شروع دوسری صدی کے علماء نے کھولا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا

موجودہ دور میں جب کہ انسانی عقل و فکر نظری فلسفہ کی حدود سے نکل کر عمل اور سائنٹفک تجربات کی روشنی میں نئی اور مناسب راہیں اختیار کر چکا ہے۔ دنیائے اسلام کے لئے سابقہ مستعمل فقہی تشریحات پر عمل پیرا رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیئے۔ فقہاء نے "مکمل اجتہاد" کے عملی امکانات کی حصار بندی جن اندیشوں کے تحت کی تھی ٹھوس اور عملی تجربات کی بدولت اہل اسلام اب ان مسائل کا حل جان چکے ہیں لہذا علماء عصر کو چاہیئے کہ "مکمل اجتہاد" کے متعلقہ قیود و شرائط پر نظر ثانی کرتے ہوئے ایسی راہیں نکالیں جو ایک طرف مسلمانوں کو ذہنی و خارجی کشمکش سے نجات دلائیں اور دوسری طرف اقتصادی و تمدنی مسائل کا اسلامی حل کر کے پاکستان کو کمیونزم کے سیاسی حملہ سے بچائیں۔

اس سلسلہ میں ہماری کوششیں ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ کے ان افکار و خیالات کی مرہونِ منت ہیں جو ہماری نشاۃ ثانیہ کے بنیادی محرکات ہیں اسلامی فلسفۂ عمل کے شارح اور مجدد ہونے کی حیثیت سے

آپ کا یہی مقام ہے جو نظری فلسفۂ تصوّف میں امام غزالی کا ' ہمیں پوری توجہ کے ساتھ ان کی نظم و نثر بالخصوص ان نظموں اور خطبوں کو تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کرنا چاہیئے جو اسلامی نظامِ حیات کی تشکیلِ جدید سے متعلق ہے۔

یہ مضمون طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع ہونے کے لئے پریس میں جا چکا تھا کہ اس کی ایک پلیٹ کا چربہ اڑ گیا اور سوءِ اتفاق کہ مسودہ بھی ضائع ہو گیا۔ بڑی ندامت کے ساتھ صاحبِ مضمون سے مسودہ کا مطلوبہ حصہ دوبارہ مانگا گیا تو وہ بعض پریشانیوں میں ایسے مبتلا ہوئے کہ اس سے قبل مسودہ نہ بھیج سکے۔ ہم اس غیر معمولی تاخیر پر جناب شہلائی اور ان احباب سے جنہیں اس مضمون کی اشاعت کا انتظار تھا۔ بدل معذرت خواہ ہیں

(طلوعِ اسلام)

ایک کی دولت دوسرے کا دماغ

۱۹۳۳ء کا ذکر ہے کہ ایک دولت مند سوداگر اور اس کی بہن نے ایک مفکر Abraham (Flexner) کو پچاس لاکھ ڈالر اس مقصد کے لئے دیئے کہ وہ ایک ایسی علمی "خانقاہ" قائم کرے جہاں اہلِ فکر مل کر بیٹھیں اور سوچیں۔ اس طرح سے امریکہ کی Institute For advanced Studies) متشکل ہوئی جس کا تیسرا ڈائرکٹر آج امریکہ کے "اٹیومک انرجی کمیشن" کا فنی مشیر ہے اور اس کا شمار دنیا کے ائمہ طبیعین میں ہوتا ہے۔

(نیویارک ٹائمز ۸ ۱۱/۴۸)

زندہ قوموں کے دولتمند دماغوں کی اس طرح قدر کرتے ہیں۔

اور ہمارے ہاں کے دولت مند؟